# سرسیّد احمد خاں

## حالات و افکار

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

انجمن ترقی اردو پاکستان

Marfat.com

# سر سید احمد خاں

## حالات و افکار

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

انجمن ترقی اردو پاکستان
ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشن اقبال
کراچی- ۷۵۳۰۰

Marfat.com

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان: ۵۳۹
ISBN 969-403-065-X

اشاعت اول: ۱۹۵۹ء

اشاعت دوم: ۱۹۷۵ء

اشاعت سوم: ۱۹۹۸ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت: ۷۵/-

طابع: فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ
اردو بازار کراچی

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح
انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھی اشاعتِ کتب کے لیے
اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

Marfat.com

# فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| حرفے چند | جمیل الدین عالی | ۵ |
| سر سید احمد خاں | | ۷ |
| سر سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ ورنیکلر یونی ورسٹی | | ۷۹ |
| سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ | | ۱۰۹ |
| ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتے ہیں | | ۱۲۱ |
| سر سید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ اردو لغات کا نمونہ | | ۱۲۷ |
| مصلحِ اعظم سر سید احمد خاں | | ۱۳۹ |
| سر سید بحیثیت مفکر اعظم | | ۱۴۹ |


Marfat.com

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

# حرفے چند

(طباعت دوم پر)

جیسا کہ سب جانتے ہیں، بابائے اردو مولوی عبدالحق کا تعلق سرسید احمد خاں کے مکتبِ فکر سے تھا۔ پچھلے پچاس ساٹھ برس میں علی گڑھ تحریک کے بنیادی مقاصد اور اس کے دور رس نتائج کا صحیح اندازہ جن لوگوں کو رہا ان میں بابائے اردو نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اردو زبان کی ترویج و ترقی دراصل سرسید ہی کا مشن تھا جسے بابائے اردو پورا کرنے کی عمر بھر کوشش کرتے رہے۔ چونکہ وہ سید احمد خاں کے دست گرفتہ بھی تھے اس لیے ان کی سیرت و شخصیت کا قریب سے مطالعہ کرنے اور ان کے جذبۂ حب قومی سے راست متاثر ہونے کے مواقع انھیں کافی ملے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی سرسید کا تذکرہ چھڑتا وہ آبدیدہ ہو جاتے اور ان کے کارناموں کی تفصیل بڑے خلوص اور چاؤ سے سنایا کرتے۔ سرسید کو دیکھنے والے ایک ذہین اور باریک بیں بزرگ کی زبانی احوال سید کتنا دلچسپ ہونا چاہیے اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

بابائے اردو کی خواہش یہ بھی تھی کہ مولانا حالی کی تصنیف "حیات جاوید" کے نہج سے کسی قدر ہٹ کر سرسید احمد خاں کی لائف نئی نسل کے ذہن کو پیش نظر رکھ کر لکھی جائے تاکہ نئی نسل بھی اس بزرگ قوم کی مثال کو سامنے رکھ کر اپنے فکر و عمل کو ہم آہنگ کرنے کے لیے سوچے اور کام کرے۔ افسوس کہ ان کے کئی مفید منصوبوں کی طرح ایک یہ منصوبہ بھی "تحفظ اردو" کی سرگرمیوں کی نذر ہو گیا۔ تاہم اُنھوں نے سرسید کی زندگی اور ان کی ملی خدمات پر وقتاً فوقتاً متعدد مضامین لکھے ان میں سے سات مضامین جن میں ایک ریڈیائی تقریر بھی ہے، انجمن نے یکجا کر کے ۱۹۵۹ء میں "سرسید احمد خاں، حالات و افکار" کے نام سے چھاپ دیے تھے۔ یہ بابائے اُردو کی

Marfat.com

کوئی مسلسل کتاب نہیں بلکہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔

چونکہ یہ کتاب نہ صرف عام قارئین میں ہی پسند کی جاتی ہے بلکہ بعض جامعات کے نصاب میں بھی داخل ہے، اس لیے سولہ سال بعد انجمن اسے دوبارہ چھاپ رہی ہے۔ پہلی اشاعت میں کتابت کی جو اغلاط تھیں انھیں حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امید ہے کہ نئے پرانے پڑھنے والے اس سے مطلوبہ فائدہ اٹھائیں گے۔

۱۹۷۵ء

Marfat.com

# سر سید احمد خاں

1. تصویر جس قدر بڑی، شان دار اور نفیس ہوتی ہے اُسی قدر اُسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اُس کے خدوخال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنھوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کارِ نمایاں کیے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ اُن میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف پیدا نہ کیے)۔ موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ اُن میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی۔ خودغرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی۔ رائے کے جانچنے کے لیے نیت بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور اُلجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدت کے بعد جب بے جا مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔

2. سر سید احمد خاں ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح گزرے ہیں۔ اُن کی وفات کو اس وقت پچاس سال سے اوپر ہوتے ہیں اور اگر اُن کے ملکی یا قومی کام کی مدت کو بھی جوڑ لیا جائے (جو "آثار الصنادید" کی تصنیف سے شروع ہوتی ہے) تو ایک صدی ہوتی ہے۔ اب نہ وہ عقیدت مند ہی رہے جو اُن کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے تھے اور نہ وہ مخالف جو اُن کے ہر کام کو ریاکاری، خوشامد اور اسلام دشمنی پر محمول کرتے تھے۔ اس لیے بے لاگ مورخ کے لیے موقع ہے کہ وہ اُس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر اُن کی زندگی اور اُن کے کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائے۔ میں نے اس نیت سے قلم نہیں اُٹھایا۔ یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کا اہل بھی نہیں۔ لیکن چونکہ مجھے کئی سال تک اُن کو پاس سے دیکھنے اور اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے اس لیے میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے اُنھیں کیسا پایا اور

Marfat.com

وہ کس کردار اور سیرت کے انسان تھے۔

سرسید نے اصلاح کا بیڑا اُس وقت اُٹھایا جب کہ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مسلمانوں پر افسردگی اور مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے توہمات، تعصبات اور اختلافات میں مبتلا تھے۔ اُنھوں نے اُس کے دُکھتے ہوئے پھوڑے اس طرح چھیڑے کہ لوگ بلبلا اُٹھے اور آمادۂ پیکار ہوگئے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ اُن کی نظر سے نہ بچا۔ ایک ایک پر تنقیدی نظر ڈالی۔ کھرے کھوٹے کو پرکھا اور بلاخوف لائم بڑی اخلاقی، جرأت، دلیری اور بے باکی سے وہ بات کہہ دی اور لکھ دی جسے وہ سچ سمجھتے تھے۔ اس پر بڑا شور غل مچا۔ اخباروں میں لے دے ہوئی۔ خاص کر "اودھ پنچ" میں اُن کے خیالات مسخ کرکے بڑی بھیانک صورت میں پیش کیے گئے اور اُن کی ہنسی اُڑائی گئی۔ کافر، ملحد، للذہب، دجّال، کرسٹان کے خطاب دیے گئے اور کفر کے فتوے لکھے گئے۔ ان مخالفتوں سے کبھی اُن کے دل پر میل نہ آیا۔ بلکہ اُس سے اُن کے کام میں اور گرمی اور جوش پیدا ہوگیا۔ بعض اوقات وہ بے جا اعتراضوں اور تہمتوں کا جواب بھی لکھتے۔ ان جوابوں میں اُن کی انشا پردازی اور ظرافت کا رنگ بہت دلآویز نظر آتا ہے مثلاً:

مولوی علی بخش سب آرڈی نیٹ جج گورکھ پور اور مولوی امداد علی ڈپٹی کلکٹر کانپور سرسید کے شدید مخالفوں میں سے تھے جو اُن کے ہر کام اور ہر بات کو سخت بدگمانی اور نفرت سے دیکھتے تھے۔ ان بزرگوں نے سرسید کی تحریروں اور خیالات کے رد میں رسالے لکھے، اخبار جاری کرائے اور عجیب عجیب الزام اور بہتان لگائے۔ مولوی علی بخش نے اسی نوعیت کی ایک کتاب "تائید الاسلام" لکھی۔ جس کے جواب میں سرسید نے ایک مضمون دافع البہتان لکھا۔ جس کا آخری فقرہ یہ ہے: "جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج نے کیوں ایسے سخت اور محض بہتان مجھ پر کیے ہیں۔ بہ ظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ اُنھوں نے خیال کیا ہوگا کہ للوحج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کرلیں۔ حج کے بعد تو سب پاک ہی ہو جاویں گے۔ جیسے کہ بعض آدمی جب مُسہِل لینا چاہتے ہیں تو خوب بد پرہیزی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مُسہِل سے سب کھایا پیا نکل جاوے گا۔ مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیے کہ حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہوگئے ہوں گے اور

Marfat.com

شبلی و جنید کے مرتبے پر آپ پہنچ گئے ہوں گے مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کیے ہیں جب تک میں ہی نہ معاف کروں معاف نہیں ہوسکتے پس مقتضائے ایمان داری یہ ہے کہ حج درِ احمد کا احرام باندھیے اور گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزہ آپ کو معلوم ہوجائے گا"۔

جب سرسید ولایت سے واپس آئے اور "تہذیب الاخلاق" جاری ہوا تو مولوی امداد العلی نے سرسید کو اپنا چھپا ہوا ایک رسالہ بھیجا جس میں مفتی سعد اللہ صاحب کے "فتوائے تکفیر جناب سید احمد خاں" کی دھمکی دی تھی اور لکھا تھا کہ یہ فتوا راقم کے پاس موجود ہے۔ معلوم نہیں سید احمد خاں کے حوارین اس فتوے پر ایمان رکھتے ہیں یا نہیں۔ سرسید "تہذیب الاخلاق" میں اس دھمکی کی نسبت لکھتے ہیں: "پہلے تو ہم گھبرائے کہ یہ مفتی سعد اللہ کون ہیں؟ یہ وہی ہیں جن کو ہم نے دلی میں دیکھا ہے اور یہ وہی مفتی سعد اللہ صاحب ہیں جنھوں نے لکھنو میں ایک نیک بخت مسلمان آلِ رسول ابنِ علی اولادِ نبی کے کفر اور قتل کا فتوا دے کر عشرہ محرم میں اُن کا سر ہنومان گڑھی سے نیزے پر چڑھا کر لکھنو میں لانا چاہا، تو ہمارا دل ٹھنڈا ہوگیا اور سمجھے کہ آلِ رسول کے قتل و کفر کا فتوا دینا اُن کا قدیمی پیشہ ہے"۔

(زندہ دلی اُن کی فطرت میں تھی۔ اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات اور واقعات اُن پر ہجوم کر کے ٹوٹ پڑے تھے۔ لیکن اُن کی زندہ دلی میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنے بعض ہم عمر بے تکلف دوستوں سے بڑی دل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے بلکہ چھوٹوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہ زندہ دلی اُن کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی۔)

مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) ایک بار اُن کے ہاں مہمان تھے۔ ایک روز وہ اپنے کمرے سے کرتا پاجامہ پہنے سید صاحب کے بڑے کمرے میں آگئے جہاں وہ بیٹھے کام کیا کرتے تھے۔ مولوی مشتاق حسین کی توند ذرا بڑھی ہوئی تھی۔ پاجامہ کھسک کھسک جاتا تھا اور وہ بار بار ہاتھ سے اوپر چڑھاتے جاتے تھے۔ سید صاحب نے جو دیکھا تو کہنے لگے "میاں مشتاق حسین تمھارا پاجامہ ہمیشہ کھونٹی پر ٹنگا رہتا ہے"۔ بعض اوقات وہ لڑکوں کی سی شرارتیں کر بیٹھتے تھے جو باتوں سے بڑھ کر عمل تک پہنچ جاتی تھیں۔ میں اگر انھیں لکھوں تو شاید بعض سنجیدہ مزاج حضرات ناک بھوں چڑھائیں۔

Marfat.com

اس قسم کی حرکتیں زیادہ تر مولوی سید زین العابدین خاں سے ہوتی تھیں۔ جو سید صاحب سے بڑی عقیدت اور خلوص رکھتے تھے اور محض اُن کی محبت کی وجہ سے پنشن کے بعد علی گڑھ میں آبسے تھے۔ اُن کا بنگلہ سید صاحب کی کوٹھی کے قریب ہی تھا۔

ایک روز شب کے کھانے میں سید صاحب کے علاوہ زین العابدین خاں، سید محمود اور دو ایک اور صاحب شریک تھے۔ کھانا شروع ہو گیا تھا کہ اتنے میں زین العابدین خاں صاحب کا ملازم ایک خوان لیے ہوئے آیا۔ سید صاحب نے اُسے اپنے پاس بُلالیا۔ دیکھیں بھئی کیا ہے۔ خوان پوش اُٹھا کر پیالے اور قابیں اُٹھا اُٹھا کر تڑا تڑ پھینکنی شروع کیں۔ زین العابدین صاحب نے کرسی پر سے اُٹھ کر غل مچانا شروع کیا۔ ہائیں ہائیں کیا کرتے ہو۔ وہ ہائیں ہائیں کرتے رہے اور اِدھر سب پیالے اور قابیں شہید ہو گئیں۔ کہنے لگے نامعقول ہماری میز پر اپنے گھر سے کھانا منگاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک صاحب کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اُن کا اصلی نام تو سعید احمد خاں تھا، لیکن کالج میں وہ گڑھ کپتان کے نام سے مشہور تھے۔ یہ عجیب بزرگ تھے۔ اپنے لباس، رفتار و گفتار میں سب سے نرالے۔ کالج کے تعمیری کام کی نگرانی کرتے تھے۔ کالج کا کوئی انجنیئر نہ تھا۔ انجنیئر، نقشہ نویس، افسر پیمائش خود سید صاحب ہی تھے۔ اُن کی ہدایت کے مطابق خاں صاحب کام کی نگرانی کرتے تھے۔ سید صاحب ہر روز شام کو آتے اور دن بھر کے کام کا جائزہ لیتے۔ جہاں کوئی غلطی ہوتی اُس کی اصلاح کرتے۔ خاں صاحب کو تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی وہ طالب علموں کے کمروں میں بھی آجاتے اور اپنے اقوال سے مستفید فرماتے اور صوفیانہ دُہرے وغیرہ سناتے۔ علاوہ اور خصوصیتوں کے ایک بڑی خصوصیت اُن میں یہ تھی کہ بغیر گالی کے بات نہ کرتے۔ گالی اُن کا تکیہ کلام تھا۔ بیچارے مزدوروں پر اُس کی خوب مشق ہوتی تھی۔ اس میں نئی نئی ایجادیں بھی کرتے تھے۔ لیکن اُن کو کبھی یہ خیال نہ آتا کہ وہ سچ مچ گالیاں دے رہے ہیں۔ یہ اُن کے لیے معمولی سی بات تھی۔ ایک روز کچی بارک کے کونے والے مکان میں خاں صاحب چارپائی پر لیٹے تھے۔ ایک طرف میر ولایت حسین صاحب بیٹھے تھے دوسری طرف میں تھا۔ اتنے میں گوالا آیا جو کالج کی گایوں کی رکھوالا تھا۔ خاں صاحب نے اُسے کسی بات پر اپنی زبان میں ڈانٹنا شروع کیا۔ گوالا نے کہا خاں صاحب گالیاں تو نہ دیجیے۔ خاں صاحب نے میر صاحب کی طرف پلٹ کر کہا

Marfat.com

دیکھا میر صاحب میں نے اس مادر..... کو کب گالی دی ہے۔ یہ حرام زادہ..... خواہ مخواہ مجھ پر تہمت دھرتا ہے۔ میں مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔ خاں صاحب کو اس کا مطلق احساس نہ تھا کہ اُنھوں نے کوئی گالی دی ہے۔ سید صاحب اُن کو اکثر چھیڑتے رہتے تھے۔ یہ بھی اُن سے اکثر بےتکے سوال کرتے اور وہ بھی اُن کو بےتکے جواب دیتے جو بہت ہنسی کے قابل ہوتے تھے۔

اُس زمانے میں جب کہ اسٹریچی ہال قریب تکمیل کے تھا اور آس پاس کے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں۔ ایک دن میں اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم مسجد رویہ ایک کمرے کی بنیاد پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں سید صاحب تام جھام میں آتے ہوئے نظر آئے۔ مسجد کی سیڑھیوں کے پاس اُتر گئے۔ ہمیں جو دیکھا تو پلٹ کر مجھ سے فرمایا کہ اس کے ساتھ مت پھرا کرو تم کو شیعہ کر لے گا۔ میں نے کہا، حضرت، اب تو لوگ شیعہ رہے نہ سُنّی (میرا اشارہ اُس مذہب کی طرف تھا جسے عام لوگ نیچری کہتے اور اُن سے منسوب کرتے تھے) فرمانے لگے، اِسے ایسا بنالو تو جانوں۔

۱۸۹۱ء میں سر سید ایک وفد اعلا حضرت میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے حضور میں حیدر آباد دکن لے کر گئے تھے۔ ایک بڑے جلسے میں جو نواب وقار الامرا بہادر مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا مولانا شبلی نے بھی ایک فارسی نظم اس موقع کے مناسب اپنے خاص الحان میں پڑھ کر سنائی تھی۔ جلسہ برخاست ہوا تو ایک صاحب نے آگے بڑھ کر مولانا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ سید صاحب نے فرمایا ہاتھوں کو کیا چومتے ہو ان کا منھ چومو (یہ اشارہ اُن کی خوش الحانی کی طرف تھا)۔

ایک شخص نے سر سید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر العیال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری سفارش کر دیجیے۔ میں نے انگریزی تعلیم نہیں پائی مگر عربی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اُس کے واسطے میری سفارش کر دیں"۔ سر سید نے اُن کو لکھ بھیجا "میری عادت کسی کی سفارش کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر چھپوا دیں۔ خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہے گی"۔

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ جب میں علی گڑھ میں سر سید کے مکان پر ٹھیرا ہوا تھا

Marfat.com

خان بہادر مولوی سید فریدالدین احمد صاحب سب آرڈی نیٹ جج کا رقعہ دعوت سر سید کے نام آیا۔ رقعہ کے خاتمے پر اُنھوں نے اپنا نام اس طرح لکھا "جانی فرید" (یعنی گنہگار فرید)۔ سر سید نے اُس کے جواب میں جو رقعہ لکھا تو اُس کے عنوان میں وہی لفظ لکھ دیے۔ اور "جانی فرید" سے رقعہ شروع کیا۔

کرنل گریہم لکھتے ہیں، سر سید جب لندن میں تھے ایک بار ڈیوک آف آرگائل نے ڈنر کی دعوت دی۔ جب شراب سامنے آئی تو اُنھوں نے کہا، "میں نوح کی شراب نہیں پیتا، صرف آدم کی شراب پیتا ہوں۔"

مولانا حالی لکھتے ہیں "اُن کا (سر سید کا) ایک آرٹیکل "تہذیب الاخلاق" میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جیسا کہ اہلِ سنت سمجھتے ہیں حجت شرعی نہیں ہے۔ شیعوں میں سے ایک صاحب جو بنارس میں ملازم تھے، اس آرٹیکل کو پڑھ کر خوشی خوشی اُن سے ملنے آئے۔ پہلے اُن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سر سید سے اُس آرٹیکل کا ذکر کر کے کہنے لگے، کیوں جناب! جب آپ کے نزدیک اجماع حجت نہیں تو خلیفۂ اول کی خلافت کیوں کر ثابت ہوگی؟ سر سید نے کہا حضرت! نہ ہوگی تو اُن کی نہ ہوگی، میرا کیا بگڑے گا۔ وہ یہ سُن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے کیوں جناب! اس اختلاف کے وقت جب کہ کچھ لوگ خلیفہ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اُس وقت ہوتے تو کس کے لیے کوشش کرتے؟ سر سید نے کہا، حضرت مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لیے کوشش کرتا۔ مجھ سے تو جہاں تک ہوسکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو بسوے کامیاب ہوتا" یہ سُن کر اُن کا جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن کر گھر کا رستہ لیا۔ سید نے ظرافت کے پیرائے میں مسئلہ خلافت کے متعلق اپنے عقیدے کا اظہار بڑے پُر لطف طریقے سے کیا ہے۔

سر سید پر اخباروں میں بڑی لے دے ہوتی اور آوازے توازے کیے جاتے۔ جب کسی اخبار میں اُن پر کوئی چوٹ نہ ہوتی تو تعجب کرتے چنانچہ "تہذیب الاخلاق" میں لکھتے ہیں "ہمارا حال اُس بڑھیا کا سا ہو گیا ہے جس کو بازار کے لونڈے چھیڑا کرتے تھے اور جب وہ چھیڑنے والے نہ ہوتے تو کہتی کیا آج بازار کے لونڈے مر گئے"۔

سر سید لکھتے ہیں کہ "ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ ضلع

Marfat.com

سہارن پور میں ہمارے حال پر بحث ہورہی تھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ "ہے تو کرسٹان، مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اسی کرسٹان سے ہوگی"۔ یہ نقل سُن کر میں بہت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر در حقیقت مجھ سے ایسا ہوا تو اس کرسٹانی خطاب پر ہزار مسلمانی نثار..... صائب نے ایک ناواقف شاعر سے پوچھا کہ صائب کیسا شعر کہتا ہے۔ اُس نے نہایت دلی جوش سے کہا "آں قرمساق ہمہ خوش می گوید"۔ صائب کہتا ہے "جیسی عزت مجھ کو قرمساق کے لفظ سے حاصل ہوئی، اعلاے اعلا خطاب سے بھی ممکن نہیں۔ اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ کرسٹان میرے لیے عزت قومی کا باعث ہو"۔

سرسید جب حیدر آباد تشریف لے گئے تو ریلوے اسٹیشن پر بہت سے اصحاب استقبال کے لیے آئے۔ مولوی اکبر نے جو حیدر آباد کے نہایت ممتاز اور بااثر اشخاص میں تھے، آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا لوگ آپ کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ آپ کے پاس کیا نشانی ہے۔ سرسید نے داڑھی اُٹھا کر اپنی رسولی دکھادی۔

(پروفیسر بارنی کوف نے جو لینن گراڈ کی یونی ورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں، اُردو نثر کا ایک انتخاب چھاپا ہے جس میں اردو کے مشہور ادیبوں کے مضامین یا اقتباسات ہیں۔ اُن کو سرسید کے کلام میں اپنے مطلب کی کوئی چیز نہ ملی اور ملا تو یہ لطیفہ جو اُنھوں نے مولانا حالی کی زندۂ جاوید کتاب "حیات جاوید" سے نقل کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ "ایک دفعہ وہ ریل میں سوار تھے۔ کسی اسٹیشن پر دو انگریز اُن کی گاڑی میں آبیٹھے۔ ایک اُن میں سے پادری تھا۔ اُس کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے۔ سرسید سے کہا "مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق تھا۔ میں آپ سے خدا کی باتیں کرنا چاہتا تھا" سرسید نے کہا "میں نہیں سمجھا آپ کس کی باتیں کرنا چاہتے ہیں؟" اُس نے کہا "خدا کی"۔ سرسید نے کمال سنجیدگی سے کہا "میری تو کبھی اُن سے ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے میں اُن کو نہیں جانتا"۔ پادری نے متعجب ہو کر کہا "ہیں! آپ خدا کو نہیں جانتے" اُنھوں نے کہا "مجھی پر کیا موقوف ہے، جس سے ملاقات نہ ہو اُس کو کوئی بھی نہیں جانتا" پھر کسی شخص کا نام لے کر پوچھا "آپ اس کو جانتے ہیں؟" پادری نے کہا "نہیں، میں اُس سے کبھی نہیں ملا"۔ سرسید نے کہا "پھر جس سے میں کبھی نہ ملا ہوں، نہ میں نے کبھی اُس کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا ہو، نہ مج کو اُس کے ہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ہو، اُس کو میں کیوں کر جان سکتا ہوں"۔

Marfat.com

پادری یہ سن کر خاموش ہورہا اور دوسرے انگریز سے انگریزی میں کہا کہ یہ تو سخت کافر ہے"۔

یہ تو خیال نہیں ہوسکتا کہ پروفیسر صاحب اسے سچ مچ سرسید کا اعتقاد سمجھے ہوں لیکن انھیں اپنے سوویٹ طالب علموں کے لیے اس سے بہتر تحفہ اردو ادب میں نہیں مل سکتا تھا۔

ایک اور لطیفہ جو میں پہلے بھی سن چکا تھا اور جسے مولانا حالی نے بھی نقل کیا ہے سننے کے قابل ہے۔ ایک بار وہ سخت بیمار پڑے تھے۔ ڈاکٹر نے تقویت کے لیے ایک دوا تجویز کی۔ پوچھا اس میں شراب تو نہیں۔ کہا ہے تو سہی۔ یہ سن کر پینے سے انکار کردیا اور مومن کا یہ شعر پڑھا۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

سید صاحب کے ایک منشی تھے۔ اُن کا نام نجم الدین تھا۔ ذرا چھوٹے قد کے تھے۔ سید صاحب اُنھیں ٹٹو کہتے تھے اور اسی نام سے مشہور ہوگئے۔ اب تک زندہ ہیں۔ اُن سے وہ خط لکھواتے یا کبھی مسودہ صاف کرواتے۔ اُن کا خط بہت صاف اور اچھا ہے۔ ان کی ظرافت، خوش طبعی اور شوخی کے چٹکلے اور لطیفے ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں جو افسوس کسی نے جمع نہیں کیے۔ اگر ان کے خطوط جو تعداد میں بے شمار تھے یکجا مرتب ہوجاتے تو اُن میں علاوہ اور بہت سے نکتوں کے اُن کی ظرافت کے پر لطف لطیفے بھی ملتے۔ ان کے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے وہ اصل خطوں کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بار گراں کے ہلکا کرنے میں سب سے بڑی معین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔

یوں تو عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر اُن کی پوری ہمت اور توجہ صرف ہوئی وہ تعلیم تھا۔ باقی سب تحریکیں خواہ مذہبی یا سیاسی، معاشرتی یا ادبی سب اسی کے ذیل میں آجاتی ہیں۔

Marfat.com

اُنیسویں صدی میں ابتری اور طوائف الملوکی ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ لڑائی جھگڑے، بدعنوانیاں، دست درازیاں عام ہو گئی تھیں۔ رعایا بدحال اور پریشان تھی۔ ان حالات میں انتظام، انصاف اور امن و امان مفقود تھا۔ انگریز اپنی دانش مندی و تنظیم اور عیاری کے بل پر اور اہلِ ملک کی بے اُصولی، غفلت اور غدّاری کی بدولت ملک پر چھائے جا رہے تھے۔ جہاں جہاں اُن کا قبضہ ہوجاتا تھا وہاں انتظام اور امن وامان کی صورت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جب رفتہ رفتہ ان کے قدم جم گئے اور استقلال حاصل ہو گیا تو انھوں نے عدالتیں، انتظامی دفاتر، ڈاک خانے، تار، ریلیں، مدرسے اور یونی ورسٹیاں قائم کیں۔ جن لوگوں نے پہلے کی بد نظمی، غارت گری اور بدامنی دیکھی تھی وہ انگریزوں کی دانش مندی اور انتظامی قابلیت کے قائل ہو گئے اور ان کی حکومت کو بہت غنیمت سمجھنے لگے۔ ہمارے زمانے میں جو بڑے بوڑھے رہ گئے تھے وہ اسی خیال کے تھے۔ سیاسی اور اقتصادی مسائل بہت بعد میں رونما ہوئے۔ جان و مال کی حفاظت اور امن سب سے مقدم ہے۔

سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کی حالت بھی دیکھی تھی اور بعد کی بھی۔ اُنھوں نے دلّی کی سوسائٹی اور قلعہ کی صحبتیں اپنی آنکھ سے دیکھی تھیں۔ دیکھی کیا تھیں اُن میں پرورش پائی تھی۔ زوال بہت پہلے سے شروع ہو گیا تھا مگر زوال کا احساس نہ تھا۔ غفلت، بے حسی، آرام طلبی، کم ہمتی، خودغرضی عام تھی اور مستقبل سے بے خبر البتہ ماضی کا فخر ضرور باقی تھا۔ دنیا میں جو نیا انقلاب اور نئے حالات پیدا ہو گئے تھے وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے، یہ نہیں کہ ان میں باہمت، اولوالعزم، بہادر، صاحب فکر اور ہم درد لوگ بالکل نہ تھے۔ کہیں کہیں ضرور تھے مگر عام اخلاق گر گئے تھے۔ قومی شیرازہ بکھر گیا تھا اور کوئی ایسا نہ تھا جو اس بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک رشتہ میں منسلک کرے اور غفلت سے بیدار کر کے آگے بڑھنے کا صحیح رستہ دکھائے۔ انگریزی حکومت میں سب سے زیادہ خسارے میں مسلمان رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو اُن پر تباہی و بربادی اور مصائب و آلام کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ انگریز ان کو ۱۸۵۷ء کی شورش کا بانی، اپنا دشمن اور اپنی حکومت کا غدار سمجھتا تھا اور ان کو مٹا دینے پر تُلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے حکومت اِن سے لی تھی۔ وہ فاتح تھا اور یہ مفتوح۔ مفتوح ہندو بھی تھے مگر ان کو اپنا مخالف نہیں بلکہ دوست سمجھتا تھا۔ ادھر ہندو جو مسلمان کا مفتوح رہ چکا

تھا، خوش تھا کہ اُسے مسلمان سے بدلہ لینے کا اب موقع ملا ہے۔ مسلمانوں کی حالت بڑی نازک اور قابل رحم تھی۔ وہ چکی کے دو پاٹوں میں پسا جاتا تھا۔ بہت سی جاگیریں اور زمینداریاں بغاوت کے الزام میں سرکار میں ضبط ہو چکی تھیں۔ جو باقی تھیں وہ غفلت اور عیش پسندی کی بدولت ہاتھ سے نکلتی چلی جا رہی تھیں۔ سرکاری ملازمت سے وہ ویسے ہی محروم تھا۔ اگرچہ اسلامی حکومت کو زوال آچکا تھا لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اُس کے بعد بھی قصبات وغیرہ میں مسلمانوں کا اثر باقی تھا اور باوجود اقلیت کے وہ اکثریت پر بھاری تھے۔ لیکن یہ چند روز کی بہار تھی۔ آفتابِ اقبال گو غروب ہو گیا تھا لیکن ڈوبتے سورج کی ہلکی شعاعیں ابھی کچھ کچھ پڑ رہی تھیں۔ ان کے جاتے ہی اندھیرا ہو گیا۔

سید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کے طوفان میں خود بھی بڑی کھکھیڑ اُٹھائی تھی اور اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور ذلت کے ایسے دردناک منظر دیکھے تھے جو بھلائے نہیں بھولتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں پر مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اُن پر خود بھی کچھ دن! مایوسی کا عالم رہا اور اس درد سے بے تاب رہے۔ یہاں ہم اُنھیں کی تحریر پیش کرتے ہیں جس کے ایک ایک لفظ سے ان کا دردِ دل اور قوم کی سوگواری ٹپک رہی ہے۔

"بعوض اُس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ ملکیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دُنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور در حقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اُس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اُس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مراد آباد آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا تو اس غم کو اور ترقی ہو گئی۔ مگر اُس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے

Marfat.com

دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا"۔

اس کے بعد ان کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ قوم کو اس ورطۂ مذلت سے کیوں کر نکالا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کا علاج صرف تعلیم ہے اور تعلیم بھی جدید۔ یہ ساری آفت اور مصیبت، پسماندگی اور محرومی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہ دنیا کے حالات سے بے خبر اور ترقی کی جدید راہوں سے ناواقف ہیں۔ جہالت تمام برائیوں اور عیوب کی جڑ ہے۔ لیکن مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو سخت نفرت تھی۔ انگریز سے بھی زیادہ۔ انگریز جب ہمارے ملک میں آئے تو ہمارے بزرگ اُن کی تہذیب و اخلاق اور ان کے اطوار و کردار کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اُن کے طریقے ہم سے بالکل مختلف تھے۔ ان کا کھانا، پینا، رہنا، سہنا، بات چیت، لباس غرض کوئی بات ہم سے نہیں ملتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں کو اُن کی ہر چیز سے نفرت تھی اور اُس کو نجس سمجھتے تھے۔ دہلی کالج میں جب ایک اعلا انگریز حاکم آیا اور اُس نے مولوی صاحب سے مصافحہ کیا تو مولوی صاحب نے وہ ہاتھ الگ تھلگ رکھا اور اُس کے جاتے ہی رگڑ رگڑ کر دھو ڈالا۔ ہمارے اُس وقت کے ایک لغت نویس نے فرنگی کی یہ تعریف کی ہے "یکے از جانورانِ دریای کہ گاہ گاہ بہ ساحل نمودار می شود"۔ اس جملہ کا آخری جُز بہت لطیف اور پُر معنی ہے۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ انگریز کاریگر اچھا ہے۔ بندوق، توپ اچھی بنا لیتا ہے۔ رہا علم سو اس سے بے بہرہ ہے۔ نئے مدرسوں اور کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اُسے وہ علم نہیں سمجھتے تھے اور ان مدرسوں اور کالجوں کو مجہلے کہتے تھے۔ اسی لیے انھیں انگریزی تعلیم سے نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ مسلمانوں کو مذہب سے منحرف کرنے اور عیسائی بنانے کی ترکیب ہے۔

اس تعصب کا توڑنا آسان کام نہ تھا۔ اس میں اہلِ علم اور عوام ایک تھے۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ جب سرسید نے اس منزل میں قدم اُٹھایا تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا اور انھیں کرسٹان، ملحد، کافر کے خطاب عطا ہوئے۔ لوگوں کا عام طور پر یہ خیال تھا اور یہ کسی قدر صحیح بھی تھا کہ مغربی تعلیم خصوصاً سائنس کے مطالعہ سے نوجوانوں کے عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں ان کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے اور دہریت اور

Marfat.com

الحاد کی طرف میلان بڑھ جاتا ہے۔ اس خطرے کی روک تھام کے لیے سید کو مذہب کی قلمرو میں دخل دینا پڑا اور جس طرح خلافت عباسیہ کے زمانے میں جب یونانی فلسفہ اور علومِ طبیعی کے رواج نے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کیے تو علمائے اسلام نے اُن کے توڑ میں مذہب کی حفاظت اور حمایت کی کوشش کی اور انھیں کوششوں کا نتیجہ علمِ کلام ہے۔ اِسی طرح اس زمانے میں جدید فلسفہ اور سائنس کے رواج سے جو مذہب کی طرف بدظنی اور روگردانی پیدا ہو چلی تھی، اس کے مقابلے کے لیے سرسید نے نیا علمِ کلام ایجاد کیا اور اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جدید فلسفہ اور سائنس سے اسلام کی حقانیت پر کوئی حرف نہیں آتا اور ان مسائل اور خیالات اور توہمات کی تردید کی جو جزوِ اسلام سمجھے جاتے ہیں مگر درحقیقت اسلام سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ سرسید نے جب مسلمانوں میں مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اُٹھایا تھا تو لازم تھا کہ اُس سے جو خرابیاں پیدا ہوں ان کے رفع کرنے کی تدبیر کی جائے۔ یہ بڑی وجہ تھی کہ انھیں مذہبی مسائل میں دخل دینا پڑا اور جو تفسیرِ قرآن اور بے شمار مضامین لکھنے کی محرک ہوئی۔

یہ کام یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ اُسے جس طرح اپنے ہم قوموں سے لڑنا جھگڑنا پڑا۔ اسی طرح انگریزوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بہت سخت بدظنی اور عداوت جاگزیں تھی۔ اِس میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو اسلام کو مانع ترقی خیال کرتے تھے اور اسلام پر طرح طرح کے بہتان اور اعتراض کرتے تھے۔ خطباتِ احمدیہ، ابطالِ غلامی اور بے شمار مضامین انھیں خیالات کی تردید میں لکھے۔ دوسرے وہ جو مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا بدخواہ اور غیر وفادار اور اپنی حکومت کے حق میں باعثِ خطر سمجھتے تھے۔ پہلے گروہ میں مشنری اور مذہبی خیال کے لوگ تھے اور دوسرے گروہ میں ارکانِ حکومت۔ پہلا مسئلہ عام تھا اور وہ صرف ہندوستان کے انگریزوں تک ہی محدود نہ تھا۔ البتہ دوسرا مسئلہ خاص طور پر اُن انگریزوں سے متعلق تھا جن کے ہاتھ میں حکومت کا نظم و نسق اور اقتدار تھا اور اس کے لیے فوری توجہ کی ضرورت تھی۔ اس میں سرسید کو بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ ڈاکٹر ہنٹر کی زہریلی کتاب کا زبردست اور مدلل جواب جس نے ڈاکٹر صاحب کے دلائل کے پرخچے اُڑا دیے، منجملہ اسی نوع کی کوششوں میں سے بائیبل کی تفسیر بھی اسی غرض سے لکھنی شروع کی تھی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں کے دل سے بدظنی دور

Marfat.com

ہوجائے بلکہ ان کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اُن کے واجب حقوق ان کو دیے جائیں اور گورنمنٹ ان کے تعلیمی اور تہذیبی امور میں جائز امداد دے اور انگریزوں اور مسلمانوں میں باہم دوستانہ تعلقات ہوں۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت اس وجہ سے بھی اُنھوں نے محسوس کی کیونکہ بغیر انگریزی تعلیم کے انگریزوں کے کیریکٹر، ان کی تاریخ، ان کے نظم و نسق اور اُصولِ حکومت کا سمجھنا مشکل تھا۔

لوگوں میں یہ ایک عام خیال ہوگیا تھا کہ وہ انگریزی حکومت اور انگریزوں کے خوشامدی ہیں۔ بعض مخالفوں نے تو انھیں ابن الوقت تک کہہ دیا۔ جس شخص نے ان کی زندگی اور سیرت کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ کبھی ایسا خیال نہیں کرسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ عالی مرتبہ انگریزوں کو اپنے کالج میں بلاتے، جلسوں میں مدعو کرتے، لفٹننٹ گورنر، وائسرائے اور بڑے بڑے انگریز آتے، کالج کا معائنہ کرتے، ان کو ایڈریس دیے جاتے وہ جواب دیتے۔ اسی طرح ہندوستانی رؤسا، عالی مقام حکام اور والیان ریاست کو بھی مدعو کیا جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض وقت وہ اپنی تقریر میں ایسی باتیں کہہ جاتے جس میں خوشامد کا شائبہ پایا جاتا تھا لیکن وہ اُن کا سچا دلی خیال ہوتا تھا بناوٹ یا ریا نہ تھی۔ بالفرض اُسے خوشامد پر محمول کیا جائے تو اس میں کوئی ذاتی غرض نہ تھی۔ یہ سب کچھ محض قوم کے مفاد کی خاطر تھا۔ جس شخص نے ایسے نازک زمانے میں جب کہ آزادی کے نام پر زبان کٹتی ہو، حاکم کی زبان ہی قانون ہو، مارشل لا کا دور دورہ ہو، مسلمان ہونا بذات خود ایک جرم ہو، طرح طرح کے الزام تھوپ کر اُسے غیظ و غضب کا شکار بنایا جارہا ہو، "اسباب بغاوت" جیسی کتاب لکھی ہو جس پر تمام انگریز حکام بے حد برہم ہوئے اور انھیں باغی اور قابلِ دار سمجھا گیا اور پارلیمنٹ میں اس پر بحثیں ہوئیں، جو شخص آگرے کے دربار (۱۸۶۷ء) سے اس بات پر خفا ہو کر چلا آیا کہ وہاں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی نشست میں امتیاز کیا گیا اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں نیچے جگہ دی گئی جس پر بالادست حکام اور گورنمنٹ نے جواب طلب کیا حالانکہ اس دربار میں اُن کو طلائی تمغہ ملنے والا تھا۔ جس نے باوجود شمالی مغربی حکومت کے معمولی ملازم ہونے کے لندن سے واپسی پر حاکمِ وقت لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور سے ملاقات کرنا محض اس وجہ سے ناپسند کیا کہ اس نے سرسید کے تعلیمی پمفلٹ کے بعض اعتراضوں

Marfat.com

کی تردید اپنی ایک تقریر میں کی۔ سر ولیم نے اپنے ایک خط میں اُن سے دوستانہ شکایت کی۔ جس نے ڈاکٹر ہنٹر کی زہریلی کتاب کا دنداں شکن جواب دیا ہو جس میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمان مذہباً انگریزی حکومت کا غیر وفادار اور باغی ہے اور انگریزی حکومت کے خلاف لڑنا اور جہاد کرنا اس کا مذہبی فرض اور یہ کہ ہندوستان کے مسلمان اب بھی گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجبِ خطر چلے آتے ہیں۔ سرسید کے اس جواب کا انگلستان کے اخباروں میں بہت چرچا ہوا۔ اور تعریفی تبصرے چھپے اور ڈاکٹر ہنٹر پر بڑی لے دے ہوئی۔ جو سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد ﷺ" پڑھ کر بے تاب ہو گیا ہو جس میں اسلام کی حقانیت اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے کیریکٹر پر حملے اور اعتراض تھے۔ ہندوستان میں جواب کے لیے کتابوں اور نوشتوں کا کافی سامان نہ ملنے کی وجہ انگلستان کا سفر اختیار کرتا ہے اور اس کی اشاعت کے ناقابل برداشت مصارف سے زیر بار ہو کر اپنا سامان اور کتب خانہ بیچتا اور کوٹھی رہن کرتا ہے اور دن رات مسلسل محنت کر کے اپنی یادگار ایک بے مثل اور محققانہ تصنیف "خطبات احمدیہ" چھوڑ جاتا ہے۔ جس نے تعلیمی معاملے میں صاف یہ کہہ دیا ہو کہ "ہمیں گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم میں سیلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں"۔ جس شخص نے زمانۂ ملازمت میں کبھی اپنے بالادست انگریز حکام کی ناجائز سفارشوں یا احکام کی تعمیل نہ کی ہو اور اپنی آزادی کو قائم رکھا ہو۔ جس شخص نے اُن تمام یورپین افسروں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہو، جنھوں نے مدرسۃ العلوم کی مخالفت تھی یا اس کے لیے سرکاری امداد ملنے میں مزاحم ہوئے تھے۔ جس نے ہر موقع پر جب ہندوستانیوں کی سُبکی یا ذلت کی گئی ہو، انگریزوں پر سخت نکتہ چینی اور اُن کی مخالفت کی ہو، اس کو انگریزوں کا خوشامدی کہنا سراسر بہتان ہے۔

جب کبھی ان کو ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا حال معلوم ہوتا تو سخت رنج ہوتا اور بہت بگڑتے تھے۔ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں اس قسم کے واقعات کے متعلق بے شمار آرٹیکل شائع ہوئے ہیں۔ میری موجودگی میں انھوں نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ علی گڑھ میں ایک سیشن جج آئے جن کی نسبت یہ شکایت تھی کہ

Marfat.com

ہندوستانیوں سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔ سرسید اُن سے نہیں ملے۔ کچھ دنوں بعد لفٹنٹ گورنر علی گڑھ تشریف لائے۔ سرسید سے ملاقات کے دوران میں باتوں باتوں میں یہ کہا کہ اب تک آپ سیشن جج صاحب سے نہیں ملے۔ سرسید نے کہا کہ اول تو اُن کو اپنے آداب کے مطابق مجھ سے ملنے آنا چاہیے تھا۔ خیر یہ بھی نہ سہی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے اس لیے میں نے اُن سے ملنا پسند نہیں کیا۔ چند روز کے بعد سیشن جج صاحب خود ملنے آئے۔ ایسے ہی علی گڑھ میں مسٹر واٹسن کلکٹر ہو کر آئے جو کسی ہندوستانی کو جوتا اُتارے بغیر اپنے کمرے میں نہیں آنے دیتے تھے۔ سرسید اُن سے نہیں ملے۔

قومی لباس کا اُنھیں بہت خیال تھا۔ ہندوستان میں مختلف مقامات میں مختلف لباس تھے۔ اُن میں سے کسی میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔ قومی لباس کا ایک ہونا قومی یگانگت اور اتحاد کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے زبان اور مذہب، کا ایک ہونا چنانچہ اس بنا پر جیسا کہ اُنھوں نے ایک جگہ لکھا ہے سرسید نے ترکی لباس اختیار کیا جو کہ اُس وقت ملتِ اسلامیہ کی معزز ترین جماعت اور اسلام کے سب سے عظیم الشان فرماں روا کا لباس ہے۔ بعض تنگ دل اور متعصب انگریز اس لباس کو دیکھ کر بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ اسی طرح جب کوئی ہندوستانی انگریزی لباس میں ہوتا تو ناراضی کا اظہار کرتے۔ سرسید اس معاملے میں بہت سخت تھے چنانچہ جب لارڈ ڈفرن نے ایک موقع پر اپنی تقریر میں اس قسم کے تبدیلِ لباس کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا خیال ظاہر کیا تو سرسید نے اس کے جواب میں نہایت سخت آرٹیکل لکھا۔ اس معاملے میں ایک واقعہ خاص میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ میں بیان نہ کرتا، لیکن چونکہ اس سے سرسید کے خیال کی اصلی حقیقت ظاہر ہوتی ہے اس لیے مجھے بیان کرنا پڑا۔

سید صاحب کو بہت دنوں سے یہ دُھن تھی کہ کالج میں قومی لباس (جو اُنھوں نے اپنے لیے بھی تجویز کیا تھا) رائج کیا جائے چنانچہ اس خیال سے فرمائش کر کے کانپور کے کسی کارخانے سے ایک نیلگوں سیاہ (بلو بلیک) سرج کا ایک تھان تیار کرایا۔ جب یہ کپڑا آیا تو اس میں سے ایک ترکش کوٹ اپنے لیے ایک میرے لیے اور ایک سید راس مسعود کے لیے، جو اس وقت بچہ تھا، سلوایا۔ سید محمود نے شکایت کی ہمارے

Marfat.com

لیے نہیں۔ کہا اس تھان میں اتنی گنجائش نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ دلی سے سیاہ کپڑے کے ٹکڑوں پر کلابتوں سے "مدرستہ العلوم" کڑھوا لائے تھے۔ کالر پر "مدرستہ" ایک طرف اور "العلوم" دوسری طرف ٹکا ہوا تھا۔ جب کالر کا ہک لگاتے تو سامنے پورا دارالعلوم آجاتا۔ جس وقت درزی میرا کوٹ سی کر لایا تو میں اُس وقت سید محمود کے پاس دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے بلایا۔ درزی نے مجھے کوٹ پہنایا۔ وہ پہنا ہی چکا تھا کہ جھٹ سید صاحب کرسی سے اٹھے اور مجھے سلام کیا اور کہا "تم میری ہو" بجائے اس کے کہ میں سلام کرتا اُنھوں نے مجھے سلام کرنے میں تقدیم کی، اس سے مجھ پر اس قدر شرم غالب ہوئی کہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

چند روز کے بعد فرمایا کہ طالب علموں سے نام بنام دریافت کرو کہ وہ اس لباس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ میں نے بھی ایک ایک سے پوچھا اور پوری فہرست بنا ڈالی۔ سب نے اسے پسند کیا۔ صرف دو چار ایسے تھے جنھوں نے کہا ہمیں اس سے اختلاف تو نہیں البتہ کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔ ایک روز حسب معمول سید صاحب شام کو کالج تشریف لائے۔ اتفاق سے میں بھی اُدھر ہی جارہا تھا۔ گاڑی میرے پاس سے گزری تو ٹھیرالی اور پوچھا کیا ہوا۔ میں نے کہا سب طالب علم اس لباس کو پسند کرتے ہیں۔ صرف دو چار ایسے ہیں جنھیں اختلاف تو نہیں لیکن یہ کہتے ہیں اگر کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا تھا۔ اس پر بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے اُن کو نکال دو۔ اُن کی یہ خفگی بچوں کی سی تھی، دو چار منٹ رہی اور پھر کچھ نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد لفٹنٹ گورنر کالج میں تشریف لائے۔ اسٹریچی ہال میں بڑا جلسہ ہوا۔ لفٹنٹ گورنر کے ہاتھ سے انعامات تقسیم کرائے گئے۔ جو لڑکے یہ لباس پہنے ہوئے تھے اُنھیں سید صاحب نے اگلی صف میں خاص جگہ بٹھایا۔ جب انعام وغیرہ تقسیم ہوچکے اور گورنر رخصت ہونے لگے تو وہ اُن کو ہمارے پاس لائے اور خوشی خوشی یہ لباس دکھایا۔ گورنر نے بھی بہ ظاہر خوشنودی کا اظہار کیا۔ وہ جب کسی طالب علم کو اس لباس میں دیکھتے تو باغ باغ ہوجاتے۔ یہ کارروائی اُس زمانے میں عمل میں آئی جب ہمارے ہر دل عزیز پرنسپل مسٹر بیک رخصت پر انگلستان تشریف لے گئے تھے واپس آئے اور یہ رنگ دیکھا تو زبان سے تو کچھ نہ کہا اور کہتے کیا، لیکن قرائن سے یہ معلوم ہوا کہ دل ہی دل میں بہت گھٹے۔ آدمی ہوشیار تھے خاموش رہے۔ یہ ۱۸۹۴ء کا واقعہ ہے۔

Marfat.com

اسی سال کالج کی جماعتوں میں فوجی ڈرل جاری کی گئی۔ اس سے صرف سال چہارم (یعنی بی۔اے کی آخری جماعت) مستثنیٰ تھی۔ ایک دن پرنسپل مسٹر بیک جن کی تحریک سے ڈرل کا نیا نیا انتظام جاری ہوا تھا، ہماری جماعت میں آئے۔ اُن کے ہاتھ میں رنگین ریشمی ململوں کے کئی نمونے تھے۔ فرمانے لگے کہ تم اپنی جماعت کے لیے ان میں سے کون سا رنگ پسند کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ ڈرل کے لیے اس قماش کے کپڑے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ فرمایا، سوال رنگ کا ہے کپڑے کا نہیں۔ غرض ہر جماعت کے لیے الگ الگ رنگ کی ریشمی ململوں کی شیروانیاں اور پگڑیاں تجویز ہوئیں اور اسی وردی میں طالب علم ڈرل کرتے تھے۔ دنیا کے شاید ہی کسی ملک میں ڈرل پریڈ کے لیے ایسا نازک اور ملائم لباس ہو۔ لڑکے تو لڑکے لڑکیوں کی ڈرل، کے لیے بھی کوئی ایسا لباس تجویز نہ کرتا۔ ان نوجوان طالب علموں کو جو قومی بہبودی اور ترقی کے لیے جدوجہد کرنے کو تیار کیے جا رہے تھے اور جن سے قوم کی خاطر زندگی کے میدانِ کارزار میں محنت و مشقت، ایثار و جاں نثاری کی توقع تھی۔ اس قسم کے لباس میں ڈرل پرل پریڈ کرانا جو کسی رہس کے لیے زیادہ موزوں تھا کس قدر نامناسب اور مضحکہ خیز تھا۔

میں جب طالب علموں کو اس لباس میں ڈرل کرتے دیکھتا تو مجھے بہت کوفت ہوتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد میرے خیال میں یہ بات آئی کہ یہ معاملہ کسی طرح سید صاحب تک پہنچانا چاہیے۔ اس کے متعلق میں نے مولوی حمید الدین مرحوم سے بھی جو میرے ہم جماعت تھے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ معاملہ بہت نازک تھا۔ اس میں درپردہ مسٹر بیک کی شکایت نکلتی تھی۔ مسٹر بیک بڑے جابر اور خود رائے تھے۔ اُس زمانے میں ان کا اثر اور اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ میں تو خیر ایک طالب علم تھا کسی بڑے سے بڑے ٹرسٹی حتّٰی کہ نواب محسن الملک تک کی یہ مجال نہ تھی کہ ان کے خلاف سید صاحب سے کچھ کہہ سکیں۔ آخر ایک روز دل کڑا کر کے اس مہم کے سر کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مولوی حمید الدین کو بھی ساتھ لیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کو آدھے دن کی چھٹی ہوتی تھی۔ ہم کالج سے سیدھے سید صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ سید صاحب حسب معمول کام کر رہے تھے۔ ہم سلام کر کے سامنے بیٹھ گئے۔ سید صاحب برابر لکھتے رہے اور ہم خاموش بُت بنے بیٹھے رہے۔ میرا دل دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور اس

Marfat.com

سوچ میں تھا کہ اس ناگوار ذکر کو کس طرح چھیڑوں۔ اتنے میں ملازم نے کھانا چننا شروع کیا۔ کھانے کی میز اسی ہال میں تھی۔ جب کھانا آگیا تو سید صاحب اُٹھ کر کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ دوسری طرف سے سید محمود بھی آپہنچے۔ علیک سلیک کے بعد اُنھوں نے کھانے کی صلاح کی۔ میں نے کہا ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ کہنے لگے خیر یہاں آکر بیٹھ تو جاؤ۔ میں سید محمود کے پاس جا بیٹھا۔ زبان یاری نہیں دیتی تھی کہ کہوں تو کیا کہوں اور کیوں کر کہوں۔ حسنِ اتفاق کہ خود سید صاحب ہی نے جنھیں اُن دنوں قومی لباس کی دُھن سمائی ہوئی تھی، اپنے تجویز کیے ہوئے لباس کا ذکر چھیڑا، میں نے کہا، اب تو دوسرا ہی لباس شروع ہو گیا ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ میں نے عرض کیا جب سے ڈرل شروع ہوئی ہے تو اس کے لیے نیا لباس تجویز کیا گیا ہے۔ کہنے لگے وہ صرف ڈرل کے لیے ہے، اس سے ہمارے لباس کو کیا تعلق۔ میں نے کہا ڈرل کے لیے رنگین ریشمی اچکنیں اور ریشمی ململوں کی پگڑیاں تجویز کی گئی ہیں۔ کہنے لگے، ہاں میں نے بھی دیکھا۔ زین العابدین کا لونڈا برساتی ٹڈا بنا پھرتا ہے۔ سید محمود نے فرمایا کہ ڈرل پریڈ انگریزوں کی چیز ہے اس لیے ہم نے یہ کام انگریز پروفیسروں کے سپرد کر دیا ہے۔ فرض کرو میں ایک کلب بناتا ہوں اور اس کی ممبری کے لیے یہ شرط لگاتا ہوں کہ ہر ممبر دُم لگا کر آئے۔ اب ہر ممبر کو اس کی پابندی کرنی ہو گی۔ جسے یہ شرط پسند نہ ہو وہ ممبر نہ بنے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ سب کے لیے یہ شرط لازم کر دیں تو پھر۔ کہنے لگے کہ سوا تعلیم کے کوئی دوسری چیز لازم نہیں ہو سکتی اور کسی کو جبر کرنے کا حق نہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ محض اس وجہ سے ایک شخص ورزش یا کسی اور تحریک سے محروم کر دیا جائے یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا بات یہیں تک رہتی تو مضائقہ نہ تھا۔ لیکن بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ ڈرل تعلیم کے درمیانی گھنٹوں میں ہوتی ہے۔ کسی جماعت کی دوسرے گھنٹے کے بعد کسی کی تیسرے گھنٹے کے بعد، تو اب لڑکے پوٹلیاں باندھ باندھ کر لانے سے تو رہے کہ تعلیم کا گھنٹہ ختم ہوتے ہی ایک لباس بدلیں اور دوسرا پہنیں۔ اس کے لیے اتنی مہلت اور نہ اس کا موقع۔ لامحالہ ڈرل ہی کا نفیس رنگین لباس پہن کر کالج کی جماعتوں میں آتے ہیں اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی ڈرل میں جا شریک ہوتے ہیں۔ یہ سُنتے ہی سید صاحب جلال میں آگئے کانٹا ایک طرف اور چھری دوسری طرف جا پڑی۔ فرمانے لگے اس میں ایک پیچ ہے، وہ میری عُمر بھر کی محنت خاک میں ملانا چاہتا

ہے۔ میں ملکہ معظمہ کی لیوی میں بھی اسی لباس میں گیا اور کوئی تبدیلی منظور نہ کی۔ سید محمود نے کہا ہر شخص تو آپ سا نہیں ہوسکتا۔ پھر سید محمود کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آج کالج میں میرا لکچر ہے تم بھی آنا اور مجھ سے فرمایا کہ اب تم جاؤ۔ ہم اُٹھ کر چلے آئے۔ رستے بھر بہت پریشان رہا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہنے کو تو میں سب کچھ کہہ گیا، لیکن کہیں سید صاحب نے مسٹر بیک سے اس کا ذکر کر دیا تو میری خیر نہیں۔

سید صاحب نے کالج کے لیے آزیری لکچروں کی تجویز کی تھی اور پہلا لکچر اُنھوں نے خود دینا منظور کیا تھا۔ اوپر کی گفتگو میں اسی لکچر کی طرف اشارہ تھا۔ غرض نمازِ جمعہ کے بعد سید صاحب تشریف لائے۔ اسٹریچی ہال طالب علموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بڑے دروازے کے مقابل ہال کے آخر میں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک میز اور ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ سید صاحب ہال میں اس طرح داخل ہوئے جیسے کوئی جہاز آتا ہے۔ تخت پر چڑھ کر کھڑے ہوگئے اور حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ ایک کرسی اور لاؤ چنانچہ ایک اور کرسی تخت پر لاکر رکھ دی گئی۔ اُس کے بعد فرمایا کہ مسٹر بیک، کہاں ہیں۔ کسی نے کہا یہ ہیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ سید صاحب نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا کہ یہاں آکر بیٹھو۔ یہ سُن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور سمجھا کہ اب ضرور کوئی آفت آنے والی ہے۔ جب مسٹر بیک بیٹھ گئے تو اُنھوں نے اپنی تقریر یوں شروع کی:

"اے عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمھارے اُستادوں، تمھارے ماں باپ، تمھاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلے اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیلِ علوم کے لیے جمع ہو، مختلف علوم پڑھتے ہو اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائلِ علمی، عمدہ مقولاتِ اخلاق سے لُطف اُٹھاتے ہو۔ تمھارے اُستاد..... گو وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں، مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ

Marfat.com

قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اُس کو بنایا ہے۔ اُس کے حروف بہت پُرکار اور مجسم ہیں مگر اُن کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اُس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر اُن کا سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ اُس کے پڑھنے کے لیے، اُس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمھاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کُھلی رہتی ہے۔ اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمھارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ خود تمھارا اور تمھارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا چاہیے کہ اس کتاب کو کیوں کر پڑھو اور اس کے معنی کیوں کر سمجھو

"اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف یا نئی زندگی"۔ یہی اصلی کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا اور اس کالج کا ہے۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور داغ دار نہ کیا تو تمھاری آئندہ زندگی وہ زندگی ہوگی جس کے لیے انسان کو زندہ رہنا چاہیے۔ ورنہ اُس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے"۔

اس کے بعد اُنھوں نے زندگی کے مختلف زمانوں پر تبصرہ کیا کہ:

"بچپن میں تمھاری کیا حالت تھی اور ماؤں نے کس طرح شفقت اور محبت سے پرورش کی۔ یہ زمانہ بھی گزر گیا اور دوسرا زمانہ آیا جس میں تم چلنے اور پھرنے اور کھانے پینے لگے۔ یہ بھی گزر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جس میں تعلیم ہوئی اور مذہبی باتیں سکھائی گئیں۔

"یہ زمانہ بھی چند سال میں گزر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جو خطرات سے خالی نہ تھی..... کیونکہ تم ہی میں بہت سے دشمن تمھارے پیدا ہوگئے تھے اور ہر وقت تمھاری گھات

Marfat.com

میں لگے رہتے تھے..... تمہارے ماں باپ نے جہاں تک اُن سے ہوسکا تم کو ان دشمنوں سے بچایا۔ کوئی بچ گیا۔ کوئی کسی قدر بچا اور کسی قدر دشمنوں کے پنجے میں پھنسا رہا اور کوئی دشمنوں کے جال میں ایسا پھنسا کہ اس سے نکلنا ناممکن ہوا۔ مگر جو بچے یا کسی قدر بچے دشمنوں نے ان کا بھی ساتھ نہ چھوڑا اور گھات میں لگے رہنے سے غافل نہیں ہوئے۔ تم ان کو نہیں دیکھتے تھے اور وہ تمہارے ساتھ ساتھ رہتے تھے اور کبھی اپنی صورت اس طرح سے تم کو دکھاتے تھے کہ تم اُن کو اپنا دوست سمجھتے تھے حالانکہ وہ تمہارے دشمن تھے۔

"یہ زمانہ بھی تمہاری زندگی کا گزر گیا مگر اس درمیان میں تم اپنے دشمنوں سے واقف ہوگئے اور اُن سے پناہ میں رہنے کے لیے تم نے ایک نہایت زبردست اور عاقل ماں تلاش کی..... اور ایک نئی زندگی میں داخل ہوئے اور سمجھے تمہاری وہ عاقل ماں ہے کون؟ یہ کالج ہے جس میں تم داخل ہوئے اور اب تم سب اس کے بچے ہو۔

"تم سمجھے کہ وہ تمہاری نئی زندگی کیا ہے؟ وہ کالج لائف ہے۔ اگر تم نے اس کو اچھی طرح گزارا تو تمہارا بیڑا پار ہے ورنہ منجدھار میں ڈوبنا ہے جس کے بعد پھر اُبھرنا اور ترنا نہیں، اب تم کو اختیار ہے چاہو اپنا بیڑا پار لگاؤ، چاہو منجدھار میں ڈبوؤ.....

"اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیوں کر فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ سب سے اوّل اور تمام برکتوں کی جڑ تمہارا آپس میں سُلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم ہندوستان کے ہوں یا پنجاب کے، پورب کے ہوں یا پچھم کے، اُتر کے ہوں یا دکھن کے، جب وہ سب تمہاری اُس عاقل ماں کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے اُن کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک

Marfat.com

دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اُس پہلے اُصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچے ہو، توڑ دیا اور جس طرح ایمان کے لیے کلمۂ توحید پہلا رُکن ایمان کا ہے اسی طرح وحدت پہلا رُکن بورڈنگ ہوس کی فائدہ مندی کے لیے ہے اور جس طرح ایمان کا پہلا رُکن توڑنے سے آدمی ایمان کے لائق نہیں رہتا اس لیے تم کو لازم ہے کہ مثل ماں جائے بھائیوں کے آپس میں محبت اور دوستی برتو"۔

اس ضمن میں بورڈنگ ہوس میں ایک جگہ رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، مل کر کھیلنے، ادبی (سرگرمیوں) میں شریک رہنے کے اثرات کا ذکر کیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

"تمام چیزیں جو دُنیا میں عقلی و ذہنی ہیں اُن کا کچھ نہ کچھ نشان ظاہر میں بھی پایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اُس برادری اور دِلی محبت اور دوستی کی جو تم آپس میں اپنی عاقل ماں کے بچے ہونے میں رکھتے ہو ظاہری نشانی کیا ہے؟ یہ نشان کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے جس کے پورا نہ کرنے سے تم صرف دُنیا ہی میں ملامت کے قابل نہیں ہوتے بلکہ خدا کی ناراضی کے بھی مستحق ہوتے ہو۔ وہ نشان کیا ہے؟ جماعت کی نماز ہے جو خدا نے جیسا کہ وہ واحد ہے تمہاری آپس کی وحدت کے لیے مقرر کیا ہے"۔ پھر نماز سے جو عملی طور پر یگانگت پیدا ہوتی ہے اُس کی توضیح کی"۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

"ایک اور چیز اُس وحدت اور آپس میں یگانگت پیدا کرنے کی ہے۔ وہ کیا ہے؟ تم سب بورڈوں کا اور خصوصاً کالج کلاس کے طالب علموں کا ایک سا لباس ہونا۔ شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس کو تسلیم نہ کرتے ہوں اور کہتے ہوں کہ ظاہری چیزوں کو اندرونی جذبات کی اصلاح سے کیا تعلق ہے مگر یہ محض غلطی

Marfat.com

ہے۔ مذہب کی رو سے، دُنیا کے برتاؤ سے بہت سی ظاہری
چیزیں ایسی ہیں جو اندرونی جذبات پر اثر کرتی ہیں"۔

اس سلسلے میں اُنھوں نے مختلف جماعتوں اور فرقوں کی مثالیں دیں کہ لباس کی یکسانی سے اُن میں کیسی ہمدردی اور یک جہتی اور محبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

"جو لباس اب تمھارا ہے یعنی ترکی ٹوپی اور کوٹ اور انگلش
بوٹ یہ نہایت عمدہ ہے۔یہی لباس سلطان روم اور اُن کے امرا
اور نوکر چاکروں کا ہے۔ اسی کو ہم نے اختیار کیا ہے"۔

اس کی تصریح کرنے کے بعد فرمایا:

"ہندوستان میں بعض کوتاہ نظر یا مغرور اور کم بین انگریز جو
ہندوستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے
ہیں۔ ایسی ٹوپی، کوٹ اور بوٹ پہنے ہوئے جانے پر اعتراض
کرتے ہیں"۔

اس آخری فقرے پر اس زور سے چیرز ہوئیں کہ سارا ہال گونج اُٹھا۔ مسٹر بیک کا رنگ فق ہو گیا اور منھ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ اس ہال میں بیسیوں کیا سیکڑوں جلسے ہوئے ہیں اور بعض بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے ہوئے لیکن کسی جلسے میں اس جوش و خروش اور زور سے تالیاں نہیں بجائی گئیں جیسے اس موقع پر۔

اس کے بعد یہ فرمایا کہ:

"جو انگریز ان باتوں میں تکرار کرتے ہیں میرے یقین میں وہ
اس امر کے ماسٹر ہیں کہ کبھی ہندوستانیوں اور انگریزوں میں
دوستی و محبت اور اخلاص کا برتاؤ نہ ہو۔ باوجود اُن کوششوں کے
جو میں نے مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد اور دوستی پیدا کرنے
کی کی ہیں ایسے انگریز سے جو ان باتوں میں کاوش کرتا ہو میں خود
کبھی اُس سے نہیں ملتا اور دوستی کرنا نہیں چاہتا"۔

اس کے بعد انھوں نے سلسلۂ کلام دیر تک جاری رکھا۔ جلسہ برخاست ہونے پر طالب علم اپنے کمروں میں گئے رنگین ریشمی ململ کی پگڑیاں نکالیں۔ اُنھیں پھاڑ پھاڑ کر

Marfat.com

کسی نے قمیضیں بنائیں اور کسی نے کمرے کے پردے اس طرح یہ قضیۂ نامرضیہ ختم ہو گیا۔

جسٹس سید محمود کا چیف جسٹس الہ آباد سے کسی معاملے میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ چیف جسٹس نے ان کی شکایت گورنمنٹ کو لکھ بھیجی۔ سید محمود نے اس کا جواب لکھا جو کئی سو صفحوں پر تھا۔ لیکن اسی اثنا میں اُنھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ سید صاحب اس معاملے کے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب اُن کے احباب اور دوسرے لوگوں نے بہت تقاضا کیا تو اُنھوں نے مجبوراً ایک مضمون اپنے اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں شائع کیا جس میں سید محمود کی سیرت کی بہت ہی دلچسپ تصویر کھینچی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ انگریز کے دماغ میں اب تک فاتح ہونے کا غرور سمایا ہوا ہے اور اُسے کسی طرح یہ گوارا نہیں کہ گورا اور کالا ایک بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھیں۔ اس مضمون کا بڑا چرچا ہوا اور کانگریسی اخباروں نے اُسے خوب اُچھالا۔

اس میں شک نہیں کہ وہ انگریزی حکومت کو ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں موجبِ برکت سمجھتے تھے چنانچہ اُنھوں نے اس خیال کا اظہار صاف صاف اِن الفاظ میں کیا ہے:

> "میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ کی بدولت نکل سکتے ہیں"۔

جسٹس راناڈے نے بھی ہندوستان میں انگریزی حکومت کو مصلحتِ خداوندی اور برکت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرسید نے یہ بھی صاف صاف کہا ہے کہ انگریزوں سے ہمیں جو توقع تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ ۱۸۸۴ء میں علی گڑھ میں ڈنر پر مسٹر بلنٹ کا جامِ صحت تجویز کرتے وقت اُنھوں نے فرمایا "اگر ہماری کسی آرزو سے وہ (مسٹر بلنٹ) واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی طرف سے سمپتھی کی خواہش ہوگی جس کی نسبت بلاشبہ میں کہوں گا کہ ہماری وہ خواہش پورے طور پر

Marfat.com

پوری نہیں ہوئی"۔ اسی تقریر میں یہ بھی کہا "وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت قائم ہوئی ایسا زمانہ تھا کہ بچاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تاکہ گاسپل کے عہد نامے کے مطابق وہ دونوں مل کر ایک تن ہوں۔ مگر اس وقت اس پر کچھ کہنا ضروری نہیں کہ انگلش نیشن نے اس پاک وعدے کو کہاں تک پورا کیا"۔

سرسید نے انگریزوں کی بدگمانی جو اُنھیں مسلمانوں سے تھی اور مسلمانوں کی نفرت جو انھیں انگریزوں سے تھی، رفع کرنے میں طرح طرح کے جتن کیے۔ مغربی تعلیم اس غرض کی اصل بنیاد تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے امور معاشرت میں بھی اُسی جرأت سے کام لیا جیسے تعلیم اور مذہب کے معاملے میں۔ مسلمان انگریز اور اس کے کھانے کو نجس سمجھتے تھے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک میز پر کھانا کھانے کو بمنزلہ ترکِ اسلام کے خیال کرتے تھے۔ سرسید نے اس قسم کے توہمات اور تعصبات کا بڑی سختی سے مقابلہ کیا۔ جوازِ طعامِ اہلِ کتاب پر رسالہ لکھا اور خود اس بدعت کے مرتکب ہوئے۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی اور بڑا شور غل مچا۔ وہ حق پر تھے اور دُھن کے پکے تھے۔ آخر غالب آئے۔ یہ ہندوؤں کی چھوت چھات کا اثر تھا۔ اس کفر کو سید احمد خاں نے توڑا اور ایک دن وہ آیا کہ وہی لوگ جو اس فعل پر طعن تشنیع کرتے تھے انگریزوں کو دعوتیں دے دے کر ان کے ساتھ بیٹھ کر شوق سے کھانے لگے۔

سرسید کی غرض یہ تھی کہ باہم میل جول اور ربط وضبط بڑھے۔ باہمی نفرت اور بدگمانی رفع ہو اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوں۔ اُن کا منشا یہ تھا کہ ہمارا تعلق انگریزوں سے حاکم و محکومانہ نہیں دوستانہ ہونا چاہیے۔ اسی خیال سے اُنھوں نے لباس میں بھی تبدیلی کی اور انگریزی طرزِ معاشرت بھی اختیار کی، جہاں تک میں نے انھیں دیکھا ہے ان میں انگریزی طرزِ معاشرت معمولی تھی۔ کھانا وہ بے شک میز پر کھاتے تھے اور حسبِ ضرورت چھری کانٹا بھی استعمال کرتے تھے۔ لیکن کھانا اُن کا ہندوستانی ہوتا تھا۔ وہی کھانا جو عموماً مسلمان شرفا کے ہاں کھایا جاتا ہے۔ گھر میں وہ کرتا پاجامہ (غرارہ) پہنے کام کرتے رہتے تھے۔ کالج میں جب کبھی تعمیر کا کام دیکھنے آتے تو ایک عباسی اوپر پہن لیتے تھے۔ البتہ جلسوں میں پتلون، ترکی کوٹ اور ترکی ٹوپی پہن کر آتے تھے۔ کوٹھی بھی اُن کی فرش فرنیچر سے کوئی زیادہ آراستہ نہ تھی۔ مگر اُن کے بعض

Marfat.com

پیرووں نے اس معاملے میں بڑا غلو کیا۔ اس میں پیش پیش نواب محسن الملک تھے۔ حیدر آباد میں کوئی ان کا ٹھاٹھ دیکھتا۔ فرنیچر انگلستان سے لائے تو اس رکھ رکھاؤ اور صفائی کے لیے ایک انگریز بھی لیتے آئے۔ حیدر آباد سے آنے کے بعد یہ شوق دھیما پڑ گیا تھا۔ لیکن بہت سے سویلین اور بیرسٹر وغیرہ اپنی طرزِ معاشرت میں صاحب بہادر تھے۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرزِ معاشرت کی وجہ سے ہماری قوم میں ایک نیا طبقہ بن گیا تھا جسے "نقالوں کا طائفہ" کہنا زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ ان میں نقل ہی نقل تھی۔ ان حضرات کو عام مسلمانوں سے بلکہ اُن متوسط الحال شرفا سے بھی کوئی ربط اور اُنس نہیں رہا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس عہد کے مسلمانوں میں اصلاح کے جتنے مدعی پیدا ہوئے انھوں نے یہی کیا۔ مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے تو انتہا کردی۔ مغرب کی تقلید میں رہنا سہنا، کھانا پینا، لباس، ناچ رنگ، شراب خوری اور دوسری خرافات کو اپنا شعار بنالیا۔ یہاں تک کہ مدارس سے مذہبی تعلیم خارج کردی اور اپنی زبان کا قدیم رسم الخط بھی بدل کر رومن کردیا۔ ترکی اخبار نویسوں کا جو وفد دلّی آیا تھا وہ بار بار بڑے فخر سے اپنے آپ کو یورپین نیشن کہتا تھا۔ دلّی کے مسلمانوں کی خواہش تھی کہ جمعہ کے روز جامع مسجد میں تشریف لائیں لیکن انھوں نے یہ درخواست قبول نہ فرمائی۔ خاص کوشش سے ان کے پروگرام میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا معائنہ بھی رکھا گیا تھا مگر وہاں تشریف نہیں لے گئے اور ہندو یونی ورسٹی بنارس کو (جو ان کے پروگرام میں نہ تھی) اپنے قدوم سے مشرف فرمایا۔ امان اللہ خاں کو اصلاح کی سوجھی تو اُس نے بھی اصلاح لباس ہی سے شروع کی۔ لوگوں کو اور خاص کر مولویوں کو جبراً کوٹ، پتلون اور ہیٹ پہننے کا حکم دیا۔ حکم کی خلاف ورزی پر سزا دی جاتی تھی۔ رضا شاہ پہلوی شاہ ایران ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ اُنھوں نے لباس کے بارے میں اسی قسم کی سختیاں کیں اور پردے کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ بے پردگی کو جبراً رائج کیا۔ مشہد کے علما نے اس سے اختلاف کیا تو وہاں کے مینار پر مشین گنیں چڑھا دی گئیں اور صرف چند گھنٹوں کی مہلت دی کہ اگر اتنے عرصے میں حکم کی تعمیل نہ کی تو شہر کو اُڑا دیا جائے گا۔ مجبور ہو کر سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد گورنر نے ایک بڑا جلسہ برپا کیا اور تمام حکام اور شرفا کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں سمیت حاضر ہوں۔ ایک صاحب تنہا

Marfat.com

آئے کیونکہ اُن کی بیوی نے بھرے جلسے میں بے پردہ جانا گوارا نہ کیا۔ اُنھیں حکم دیا گیا کہ جاؤ بیوی کو ساتھ لے کر آؤ۔ وہ گئے اور اُس نیک بخت کو ساتھ لے کر آئے۔ اس کی یہ سزا تجویز کی گئی کہ وہ تمام حاضرینِ جلسہ سے فرداً فرداً ہاتھ ملائے۔ اور تو اور مولانا عبید اللہ سندھی جیسے فاضل عالمِ دین نے مولویوں کو للکارا کہ کوٹ پتلون پہنو اور ڈاڑھیاں منڈاؤ۔ مولانا نے ایک ملاقات میں مجھ سے فرمایا کہ تم نے انگریزی اُردو لغت لکھ کر بڑا کام کیا لیکن اس کا آدھا فائدہ تم نے غارت کر دیا۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ فرمایا کہ اُردو ترجمہ عربی فارسی خط میں فضول لکھا رومن حروف میں لکھنا چاہیے تھا تاکہ سارے عالم کو فائدہ پہنچتا۔

ان حالات کو دیکھ کر میں سید احمد خاں کو کس منھ سے بُرا کھوں۔ اس خدا کے بندے نے تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ ابتدا اس کی طرف سے ہوئی۔ مگر اس میں یہ غلو نہ تھا۔ اب یہ باتیں پرانی ہو گئی ہیں۔ نقالی کا پردہ چاک ہو گیا ہے۔ لوگ اب ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے۔ سر سید نے تھوڑی بہت تبدیلی جو اپنی طرزِ معاشرت میں کی وہ کسی ذاتی غرض سے نہ تھی بلکہ اس میں سراسر قومی مفاد مدِ نظر تھا۔ مولوی نذیر احمد نے جو کسی کی رورعایت نہیں کرتے تھے، سچ کہا تھا کہ "سید احمد خاں کے ظاہر حال سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ وہ اونچے درجے کے انگریزوں کی طرح ماندو بود کرتے ہیں۔ گورنروں کو مہمان رکھتے ہیں، ان کے ہم نوالہ ہیں۔ جس کے دل میں ایسا واہمہ گزرے اُس کو اس بات پر بھی نظر کرنی چاہیے کہ سید کو چار و نا چار فیل بانوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے اور بڑے پھاٹک بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر انگریزوں کی طرح ہائی لائف نہ رکھیں تو اعلا درجے کا انگریز یا اعلا درجے کا نیٹو اُن کی طرف رُخ نہ کرے"۔

سر سید کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا اور یہ خود اُن کا بیان تھا کہ "جیسا تصنیف و تالیف میں میرا جی لگتا ہے ویسا کسی کام میں نہیں لگتا"۔ یہ شوق اُنھیں ابتدا سے تھا۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں صاحب علم و فضل اور خاص کر علوم ریاضیات میں وحیدِ عصر تھے چنانچہ سر سید نے ان کے بعض رسالوں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کے ماموں یعنی خواجہ فرید الدین کے فرزند نواب زین العابدین خاں بھی فنونِ ریاضی کے بڑے ماہر تھے۔ سر سید نے ریاضی کی کتابیں

Marfat.com

اور آلاتِ رصد و اعمالِ اصطرلاب وغیرہ کے متعدد رسالے ان سے پڑھے اور نانا کے رسائل پر "کارِ متناسبہ" وغیرہ کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس خاندانی اثر کے علاوہ اس وقت کے باکمال اصحاب مثلاً مرزا غالب، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا صہبائی، نواب ضیاء الدین خاں، نواب مصطفےٰ خاں وغیرہ کی صحبت نصیب ہوئی جس میں علم و ادب اور شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ سر سید بھی شعر کہتے تھے اور آہی تخلص کرتے تھے۔ "سید الاخبار" جو اُن کے بھائی نے ۱۸۳۶ء یا ۳۷ء میں جاری کیا تھا جب کہ اُن کی عمر اٹھارہ اُنیس برس کی تھی، اس میں زیادہ تر یہی لکھتے تھے نیز بعض مذہبی اور ریاضیات کے رسائل سے قطع نظر جو اُنھوں نے ابتدا میں لکھے اُن کی معرکتہ آلارا تصنیف "آثار الصنادید" ہے جو پہلی بار ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اُس وقت اُن کی عمر تیس برس کی تھی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو دہلی کی عمارات پر کمال تحقیق اور غیر معمولی محنت اور صحت سے لکھی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے زمانے میں اور ایسی صحبتوں میں جب کہ ہمارے ادب کا رنگ کچھ اور ہی تھا اور شعر و سخن اور مذہبی تعلیم کے سوا دوسری جانب مطلق توجہ نہ تھی، انھیں اس قسم کی تحقیقات کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ اس کی تالیف میں جو محنت و مشقت اُنھوں نے اُٹھائی وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ان کا دوسرا ابتدائی علمی کارنامہ "آئین اکبری" کی تصحیح و ترتیب ہے۔ "آئین اکبری" اپنی نوعیت کی بے نظیر کتاب ہے جو اُس زمانے کی ہر قسم کی معلومات کا بے بہا خزانہ ہے۔ اس کی زبان اور طرز بیان بھی نرالا ہے۔ پھر اُس میں معمولی، مختلف انواع و اقسام کے معلومات جن کا سلطنت اور حیاتِ انسانی سے کچھ بھی تعلق ہے ایسے جمع کر دی ہیں کہ ان کا صحیح طور پر سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ ایسی کتاب کی تصحیح و ترتیب آسان نہ تھی۔ اس میں اُنھوں نے تحقیق و تلاش کی پوری داد دی ہے۔ یہی نہیں کیا کہ متعدد نسخے جمع کر کے اُن کی تصحیح کی ہو بلکہ اصل کتاب میں جو خامیاں تھیں اُنھیں رفع کیا اور جو کمیاں تھیں اُنھیں پورا کیا، فروگزاشتیں تھیں ان کی تکمیل کی اور غلطیاں جو فاضل مصنف سے ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کی۔ کئی سو سکوں کی تصویریں درج کیں اور ان کے دونوں جانب جو الفاظ تھے وہ نقل کیے۔ اصل کتاب میں کہیں کہیں تصویریں تھیں۔ سر سید نے بڑے اہتمام اور محنت سے دلی کے چابک دست مصوروں سے بے شمار تصویریں بنوا کر موقع موقع سے داخل کیں۔ غرض کہ کوئی آئین ایسا نہ چھوڑا جس کی تصویریں نہ دی ہوں۔

Marfat.com

اس کے علاوہ اپنی طرف سے بہت سے مفید اضافے کیے۔ سر سید کا یہ کام بھی حیرت انگیز ہے۔ جدید طریقۂ تحقیق و ترتیب سے اُس وقت ہمارے ہاں کوئی آشنا نہ تھا اور نہ اس قسم کے کاموں کا کسی کو شوق تھا اور نہ اُن کی کوئی قدر تھی۔ تاہم سر سید نے جس ژرف نگاہی، محنت و مشقت اور تحقیق و تلاش سے اس کام کو انجام دیا آج کل کا بڑے سے بڑا محقق بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ ان دو کتابوں کی ہمارے ملک میں تو کچھ قدر نہ ہوئی اور قدر ہوئی تو یورپ میں۔ اُس وقت سے جو تالیف و تصنیف کا تانتا بندھا تو آخر دم تک جاری رہا۔ "تاریخ فیروز شاہی" کی تصحیح و ترتیب بھی جو ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۲ء میں شائع کی اور بعد میں "تزک جہانگیری" کو مرتب کیا۔

میرا مقصود یہاں اُن کے علمی کارناموں پر تبصرہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ تالیف و تصنیف کا شوق انھیں ابتدا سے تھا، لیکن جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ علاوہ اُن گوناگوں احسانات کے جو سر سید نے ہماری قوم پر کیے ان کا ایک بہت بڑا احسان اُردو زبان پر ہے۔ ان کی تالیف و تصنیف کا زمانہ ۱۸۴۰ء سے شروع ہوتا ہے جب کہ اُن کی عمر بائیس تئیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس ابتدائی زمانے کی تالیفات چند مذہبی یا ریاضی کے رسائل تھے۔ اُن کی اصل تصنیف "آثار الصنادید" جو فی الواقع ایک علمی تصنیف ہے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اسی زمانے کے لگ بھگ ۱۸۴۵ء میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" لکھا۔ یہ کتاب از اوّل تا آخر مقفیٰ اور مسجع عبارت میں ہے۔ تکلف و تصنّع کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس قسم کی عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی ایسے حالات واقعات اور جذبات و خیالات کے ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے جن کا صداقت سے کچھ تعلق ہو۔ یہ عارضہ لکھنؤ میں بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ دلّی کی سلطنت پر جب زوال آیا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تو وہاں کے شعرا اور شرفا نے لکھنؤ کا رُخ کیا جہاں فارغ بالی اور خوش حالی کا سماں اور دولت اور عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ اہلِ ہنر خاص کر شعرا کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ شعر گوئی فیشن ہو گیا تھا اور شاعر امرا اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق اور اُن کی تفریح کا سامان تھے۔ لکھنؤ پہلے ایک بے حیثیت قصبہ تھا۔ اُسے نواب آصف الدولہ کے زمانے میں عروج حاصل ہوا اور حکومت کا مستقر فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ اب لکھنؤ دلّی کا حریف بن گیا، نئی دولت اور نئی حکومت تھی۔ اہلِ لکھنؤ نے دلّی کے مقابلے

Marfat.com

میں اپنی جداگانہ حیثیت قائم کرنی چاہی چنانچہ لباس میں، کھانوں میں، گفتگو میں، لہجے میں، طرزِ عمارت، طبابت حتیٰ کہ شعر و سخن میں نئی تراش خراش اور جدت پیدا کی۔ اُردو ادب میں اُس وقت سارا زور شعر و شاعری پر تھا۔ نثر کو یہ درجہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ لکھنوی طرز کے موجد ناسخ ہیں۔ اُن کا کلام بے مزہ، بے جان، بے اثر ہے۔ کسی تحریر یا ادب کی پشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ یہی کیفیت ناسخ اور ان کے تلامذہ اور مقلدوں کے کلام کی ہے جو تصنع و تکلف، صنائع، دور از کار تشبیہوں، استعاروں اور تلازموں، عربی فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے بھرا ہوا ہے اور بہت سے روزمرّہ کے سبک اور شیریں الفاظ کو اس لیے ترک کر دیا کہ عوام کی زبان ہے۔ ناسخ اور اُن کے خاص تلامذہ نے متروکات کا نام اصلاحِ زبان رکھا تھا۔ "فسانۂ عجائب" اور "نوطرز مرصع" اسی قسم کی کتابیں ہیں۔

یہ نثر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ صاحبِ علم اکثر مقفیٰ مسجع نثر لکھتے تھے اور فارسی عربی الفاظ کا زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ البتہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی کتابوں میں سادہ بول چال کی زبان لکھی گئی۔ یہ کالج کے انگریز ناظموں کی ہدایت کا نتیجہ تھا۔ اس کالج کی بنیاد اٹھارویں صدی کے آخری ایام میں رکھی گئی اور اُنیسویں صدی کے آغاز میں اُردو کی کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ یہ کالج گورنر جنرل مارکوئیس ولزلی نے قائم کیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کو اس سے اختلاف تھا۔ آخر کئی سال کی مراسلت اور کشمکش کے بعد توڑ دیا گیا۔ سچ یہ ہے کہ جدید نثر کا آغاز اس کالج ہی سے ہوا۔ لیکن اس کی عمر بہت کم ہوئی اور چند سال کے بعد بند ہوجانے سے اُردو ترجمہ و تالیف کا سلسلہ بند ہوگیا، اس لیے اس کی کارگزاریوں کا اثر اُردو نثر پر کم ہوا۔ زیادہ تر قصص و حکایات کی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں سے دو چار زیادہ مقبول اور مشہور ہوئیں۔ تاریخ و مذہب وغیرہ کی بھی دو ایک کتابیں ترجمہ کی گئیں لیکن ان کا رواج نہ ہوا اور ناپید ہو گئیں۔ البتہ دہلی کالج نے مغربی تعلیم کا شعبہ قائم کرکے اُردو کو تمام جدید علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم بنایا۔ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ پہلا صحیح قدم تھا جو ملک میں علم کی اشاعت کے لیے اُٹھایا گیا تھا اور مختلف علوم مثلاً طبیعیات، کیمیا، تاریخ، قانون وغیرہ کی سو سوا سو کتابیں تالیف و ترجمہ کی گئیں۔ لیکن افسوس کہ چند سال کام کرنے کے بعد اس پر ایک آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ یعنی ۱۸۵۷ء کی شورش میں اس کی حالت ابتر ہو گئی اور تعلیم

Marfat.com

و تعلم کا ولولہ دھیما پڑ گیا۔ بعد میں جب دلی کا تعلق پنجاب سے ہو گیا تو کالج بھی برخاست کر دیا گیا۔ اُس نے ایک ایسے بے مثل علمی کام کا آغاز کیا تھا کہ اگر یہ سیاسی مدبّروں کی ناعاقبت اندیشی سے بچ جاتا اور اس کا سلسلہ جاری رہتا تو اُردو کی پہلی یونی ورسٹی ہوتا۔ فرماں روایانِ وقت کی تنگ نظری اور نااہلی نے ہماری علمی ترقی کو سخت صدمہ پہنچایا۔ اُس نے جو کام کیا تھا ادھورا رہ گیا اور پھر کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ جو تار جہاں سے ٹوٹا تھا اُسے جوڑتا۔ وہیں چھٹی ہوئی منزل تک پھر سے پہنچنے کے لیے ہمیں پوری ایک صدی لگی۔

۱۵ یہ دونوں ادارے بے وقت چل بسے اس لیے کہ جن کے ہاتھ میں ان کی موت و حیات تھی، اُن میں کوئی بھی ان کا قدردان نہ تھا۔ لوگ ان کے کارناموں کو بھول بھال گئے اور ان کا اثر جیسا کہ ہونا چاہیے تھا نہ ہوسکا۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا بہت قابلِ قدر ہے لیکن اُردو زبان میں ابھی تک وہ توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک زبان کے ادب کے لیے لازم ہے۔ سید احمد خاں نے اس کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی اور اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جیسا کہ میں نے اپنے ایک خطبے (۱) میں لکھا ہے:

> "اُس نے زبان کو پستی سے نکالا، اندازِ بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا، سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے، خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔ اخبار "سائنٹفک سوسائٹی" (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) جاری کر کے اندازِ تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا۔ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ اُردو ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ ٹائپ کو رواج دیا۔ ان کی اور ان کے رفقا کی سعیِ عمل سے علی گڑھ اُردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہو گیا تھا جس کی فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی ہے۔ یہ اُردو زبان کے فروغ اور اوج کا زمانہ تھا اور ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا۔" ۱۶

سادگی و پُرکاری کمالِ صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا

آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کردیے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطفِ بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوعِ تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرزِ بیان کے ذریعہ عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابلِ فہم اور دلکش ہوجاتا ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کرسکتے۔ تحریر یا تقریر کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اُسے سمجھیں، اُس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اُٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر ہو یا تقریر محض بے کار اور تضیعِ اوقات ہے۔ سرسید کی تحریر اسی لیے مقبول ہوئی کہ وہ سادہ، پراثر اور پُرخلوص تھی۔ معمولی پڑھے لکھے شخص کی سمجھ میں آتی اور اس کے دل میں گھر کرتی۔ ان کے دل میں قوم کا درد تھا اور اُس نے اُن کی تحریر میں سادگی، اثر اور خلوص پیدا کردیا تھا۔ یہ اثر رنگین عبارت، مقفیٰ مسجع جملوں، تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ سے نہیں پیدا ہوسکتا۔

وہ اپنے مطلب کو سادہ لفظوں میں صاف صاف بیان کرنے کا بہت خیال رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ مثلاً وہ فرماتے تھے کہ بعض اوقات ضمیروں کے لانے سے مفہوم کے سمجھنے میں دشواری ہوجاتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ فلاں ضمیر کا مرجع کون ہے۔ ایسی حالت میں اسم کا اعادہ مناسب ہے خواہ کئی بار دہرانا کیوں نہ پڑے۔ اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ اس سے عبارت کی روانی یا حسن میں فرق آجائے گا۔ مفہوم کا صاف ہونا سب سے ضروری ہے۔ تار لکھنے میں لوگ عموماً بڑی سخت سے کام لیتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ کم سے کم الفاظ میں مطلب ادا ہوجائے اس سے وہ بہت ناراض ہوتے تھے اور کہتے تھے دو چار پیسوں کی خاطر مکتوب الیہ کو اُلجھن میں کیوں ڈالتے ہو۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں ایسا لکھنا چاہتا ہوں کہ میرا سائیس اور گھر کی ماما بھی اُسے سمجھ لے۔ ایک روز میں مولانا شبلی سے (جب وہ حیدر آباد میں تھے) ملنے گیا۔ مولانا برابر ٹہل رہے تھے اور کسی خیال میں محو تھے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا مولانا آپ کس سوچ میں ہیں (اس زمانے میں مولانا "علم الکلام" لکھ

رہے تھے) فرمانے لگے، "میں اب اس مقام پر پہنچا ہوں جہاں مجھے وحی و الہام پر کچھ لکھنا ہے۔ لیکن سید احمد خاں نے اس مضمون کو اپنی تحریر سے ایسا پانی کر دیا ہے کہ میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اُسے کس ڈھنگ سے لکھوں"۔ سر سید کا یہ کمال تھا کہ کیسا ہی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اُترتا چلا جاتا تھا۔

سر سید نے خود بھی "تہذیب الاخلاق" کے چار سال ختم ہونے پر اپنے اس کام کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اُردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعاراتِ خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اُس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اُس زمانے میں مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اُٹھایا۔ جہاں تک ہوسکا سادگیِ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسندیدہ طریقہ ادائے مضمون کا بالکل اُٹھتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اُردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز

Marfat.com

بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بدلے ہوئے ہیں، بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ اور سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں اُن کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں اُن پر ہو چکی ہیں اور جو اُمور اُن کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں اُن سے آگاہی ہو اور یہی سبب ہے کہ بعضی دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے اُنھیں کو پھر کھے جاتے ہیں۔ یہ نقص اُسی وقت رفع ہوگا جب کہ انواع اقسام علوم وفنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کی عموماً اُن پر دسترس ہو گی۔ سوسائٹی علی گڑھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اُس کا کام ادھورا پڑا ہے۔

"نئی اُردو نے در حقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے۔ میر و درد و ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو۔ میر امن نے کوئی شُستہ بول چال میں کہہ دی ہو کہہ دی ہو، جو اُس سے زیادہ فصیح، دلچسپ و بامحاورہ نہ ہو گی جو ایک پوبلی بڑھیا بچوں کے سُلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اُردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اِسی زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی جو اب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے اور اڈیسن کی سی ہو جائیں گی"۔

تین سال بعد وہ پھر لکھتے ہیں کہ:

"اردو زبان کا علم و ادب جو بد خیالات اور موٹے و بھدے الفاظ کا مجمع ہو رہا ہے اُس میں بھی جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اصلاح چاہی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے اس میں کچھ کیا۔ مگر ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں ان باتوں پر بقدر اپنی طاقت کے کوشش کی۔ قومی ہمدردی، قومی عزت، سیلف آنر یعنی اپنی آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہ کیا تو اِن لفظوں کو تو ضرور اُردو زبان کے علم ادب میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سُنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو علم ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا"۔

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ "تہذیب الاخلاق" یعنی سر سید کی تحریروں نے قوم میں بیداری اور روشن خیالی پیدا کی۔ توہمات اور تعصبات کے مٹانے میں بڑا کام کیا۔ متین، سادہ اور خوش گوار نثر لکھنا اسی نے سکھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر میں جو انقلاب اور ترقی ہم اس وقت دیکھتے ہیں اور اس میں جو وسعت اور ادبی علمی صلاحیت پائی جاتی ہے وہ سید کا طفیل ہے۔ یوں تو ان کی ساری عمر لکھنے پڑھنے اور تالیف و تصنیف میں گزری لیکن جب سے وہ پنشن لے کر علی گڑھ آئے اور کالج کا کام سنبھالا، "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، ان کا سارا وقت صبح سے شام تک لکھنے لکھانے ہی میں گزر جاتا تھا۔ ان کے علاوہ اور بہت سے کام نکلتے رہتے تھے، مثلاً سیاست، مذہب، جلسے، اڈریس، تقریریں، رپورٹیں، روئدادیں، مراسلت وغیرہ۔ یہ سب کچھ وہ خود ہی لکھتے تھے۔ جو شخص دن رات لکھتا رہے اور اس قدر مختلف شعبوں اور موضوعات پر لکھے اور جسے ایک بار لکھنے یا لکھانے کے بعد دوبارہ دیکھنے یا نظر ثانی کی فرصت نہ ملے اس سے یہ توقع کرنا کہ اُس کی ہر تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہو، عبث ہے۔ پھر ادائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض اوقات وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسنِ بیان کو قربان کر دیتے تھے۔ اس وجہ سے اکثر ان کی عبارت سست اور پھس پھسی معلوم ہوتی ہے لیکن جو ادبی یا علمی

تحریریں اور مضامین دل لگا کر لکھے ہیں وہ حُسنِ بیان، خوبیِ خیالات اور زبان کی سلاست و فصاحت کے اعتبار سے اُردو ادب کے خزانے میں بے نظیر جواہر پارے ہیں۔ ان میں تمام ادبی خوبیاں ہیں۔ تلمیحات بھی ہیں، تشبیہات و استعارات بھی ہیں، محاورات بھی ہیں، لطفِ زبان بھی ہے، مزاح اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے۔ لیکن ہر چیز اپنے عمل پر ہے اور تکلف و تصنع سے بری۔ وہ دوسرے ادیبوں کی طرح الفاظ اور محاورے سوچ سوچ کر اور ڈھونڈ کر نہیں لکھتے تھے اور نہ عبارت کے بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک بلاتوقف اپنے خیالات لکھتے چلے جاتے تھے اور پوری تحریر ایک مسلسل خوبصورت لڑی ہوتی تھی۔ میں اس کی بہت سی مثالیں پیش کرسکتا ہوں۔ لیکن طوالت کے خوف سے معذور ہوں۔ البتہ ان کی ایک چھوٹی سی تصنیف "سیرت فریدیہ" کا نام لیتا ہوں۔ اس میں اُنھوں نے اپنے نانا، والدہ، اپنی تعلیم، قلعہ اور اُس وقت کی سوسائٹی کے حالات بڑی بے تکلفی اور خوبی سے نہایت سادہ عبارت میں لکھے ہیں۔ یہ بڑا اچھا نمونہ ہے کہ ہمیں سوانح اور واقعات کس ڈھنگ سے بیان کرنے چاہییں۔

اُن کی تحریروں میں جگہ جگہ انگریزی الفاظ آتے ہیں جس کی لوگوں کو شکایت تھی۔ اس کا انھوں نے خود ہی جواب دیا ہے:

> "بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانے میں اردو لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں۔ مگر ان کو غور کرنا چاہیے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہوجاتی ہے تو وہ مردہ کہلاتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کرلینا اہلِ زبان کا کام ہے مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہلِ زبان غیر زبان کے الفاظ ایسی عمدگی سے ملالیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضے میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچی کاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی میں پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات اہل زبان کے سوا دوسرے سے نہیں ہوسکتی اور نہ سب اہل زبان سے

بلکہ صرف اُس سے جسے خدا نے ایسا ملکہ دیا ہے۔

"یہ بات بھی غور کرنی چاہیے کہ اہلِ زبان کو دوسری زبان کے لفظوں کے لیے لینے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے۔ اُس کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔ ایک مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے اُس کو ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی الفاظ یعنی جو تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں اور ملکوں کی تقسیم اور مناصب اُسی ملک کی زبان میں قائم رکھے۔ کیوں کہ اگر اُن کے لیے اپنی زبان کے الفاظ اور اصطلاح سے بدل دے تو وہ تاریخ نہایت نکمی اور غیر مفید ہوجائے گی۔ ٹیونس میں جو تاریخیں غیر ملکوں کی، عربی زبان میں ترجمہ نہیں، تصنیف ہوئی ہیں۔ اُن کو دیکھو کہ کس قدر غیر زبان کے الفاظ مغرب اور غیر معرب ان میں شامل ہیں۔ عربی اخبار "الجوائب" کو دیکھو اس کا کیا حال ہے۔ قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو اُس میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی زبان کے علم ادب اور علوم و فنون میں الفاظ جدیدہ شامل ہونے بند ہوجاتے تو وہ بھی مثل عبرانی و سنسکرت ورشد کے مُردہ زبان ہوجاتی۔

"علم و فنون پر کتابیں لکھنے والا بعضی دفعہ مجبور ہوجاتا ہے کہ جس زبان سے اُس علم کو لیا ہے اسی زبان کے بعض الفاظ اور مصطلحات بدستور قائم رکھے۔ دیکھو یونانی زبان سے جو علم طب عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی الفاظ اس میں شامل ہیں۔ عربی زبان سے کیمسٹری انگریزی میں گئی۔ آج تک بہت سے عربی لفظ انگریزی زبان کی کیمسٹری میں شامل ہیں۔

"پوچھو اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کیمسٹری بولا اور کیمیا کا لفظ جس سے خود انگریزوں نے کیمسٹری بنایا ہے کیوں نہ بولا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں کیمیا کے لفظ کے ساتھ چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک محض غلط خیال ہے۔

Marfat.com

اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہمدردی رکھتا ہے اور اُن غلط خیالات کو مٹانا چاہتا ہے کسی جگہ کیمسٹری اور کسی جگہ کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے تاکہ کیمسٹری کا لفظ اُس غلط خیال کو نہ آنے دے اور کیمیا کا لفظ کیمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے کا خیال پیدا کرے"۔

اُس کے بعد لفظ کی خوبی اور صلاحیت اور غلط اور صحیح پر بحث کر کے لکھتے ہیں:

"دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں بولنا کبھی عبارت کا لطف بڑھانے کے لیے ہوتا ہے کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کبھی سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت اُس مرادف سے جو اس زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں بیٹھتی۔ پس محب قوم اہلِ زبان اُن خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لیے اپنی زبان کو وسعت دیتا ہے اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے تاکہ نئے لفظ کے ساتھ نیا خیال دل میں پیدا ہو"۔

اپنی زبان میں غیر زبانوں کے لفظ لینے کی بحث بہت دلچسپ اور طویل ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں۔ میں اپنے مضمون "اردو میں دخیل الفاظ" میں اس پر کافی بحث کر چکا ہوں۔ سرسید کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات ضرورت یا مجبوری سے غیر زبان کے لفظ لینے پڑتے ہیں۔ یہ زیادہ تر اصطلاحی یا صنعت و حرفت اور سائنس کے لفظ یا اصطلاحات ہوتی ہیں۔ ایسی صنعت و حرفت اور فنون جو اپنے ملک میں نہیں ہوتے اور غیر ملک سے آتے ہیں تو ان کے ساتھ بہت سے مخصوص لفظ بھی آجاتے ہیں۔ یا ایسے لفظ یا اصطلاحیں جو اعلام سے منسوب ہوتے ہیں بجنسہ لے لینے پڑتے ہیں۔ دوسری بات اُنھوں نے یہ کہی ہے کہ بعض غیر زبان کے لفظ عظمت اور دل نشینی کی خاطر استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مترادف اپنی زبان میں موجود ہیں۔ یہ بات کسی قدر صحیح ہے۔ مثلاً سرسید اور ان کے معاصر سویلزیشن کا لفظ استعمال کرتے تھے

Marfat.com

اگرچہ تمدن کا لفظ ہمارے ہاں موجود ہے۔ لیکن اس سے وہ مفہوم پوری طرح ادا نہ ہوتا تھا جو سویلزیشن سے ہوتا ہے۔ اب چونکہ ایک مدت سے ان معنوں میں استعمال ہوتا چلا آتا ہے اس لیے سویلزیشن کا قائم مقام ہو گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ نئے تعلیم یافتہ اصحاب کی نظروں میں سویلزیشن میں جو عظمت اور جاذبیت تھی وہ تمدن میں نہ تھی۔ ان کے سامنے ان معنوں میں تمدن کہا جاتا تو وہ شاید سمجھتے بھی نہیں۔ آج کل مثلاً کلچر کا لفظ ہے۔ اس کے لیے ایک نیا لفظ ثقافت استعمال ہوتا ہے مگر یہ لفظ ثقیل اور نامانوس ہے۔ اس کا مادہ یا اس سے مشتق کوئی دوسرا لفظ ہماری زبان میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ لوگ اس لفظ کو لکھتے تو ہیں مگر مجبوری سے خوشی سے نہیں۔ دوسرا لفظ اس کی جگہ تہذیب کا مفہوم ہماری زبان میں وہ نہیں جو کلچر میں ہے۔ ان دو لفظوں کے ہوتے ہوئے لکھنے والا مطمئن نہیں ہوتا اور کبھی نہ کبھی کلچر لکھ ہی جاتا ہے۔ جب ایک مدت کے استعمال اور رواج سے ان میں سے کوئی ایک لفظ اپنی جگہ بنا لے گا تو وہ کلچر کا قائم مقام ہو جائے گا۔ لیکن ایک محب قوم اور مصلح میں بڑی بے صبری اور عجلت ہوتی ہے۔ وہ اتنے دنوں تک انتظار نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے خیالات اور منصوبوں کو جلد سے جلد عمل میں لانا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ معذور ہے اور ہم اس پر گرفت نہیں کر سکتے۔

اردو نظم کے متعلق بھی اُنھوں نے گاہے گاہے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں میں ان کا صرف ایک قول نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ آج سے ۷۷ برس پہلے اُنھوں نے ردیف و قافیہ و اوزان کی پابندی اور معرا اور آزاد نظم کے متعلق جو خیال ظاہر کیا تھا اور جس کا اب کچھ کچھ رواج ہو چلا ہے، وہ اُن کی ادبی ترقی پسندی کا بین ثبوت ہے اور یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی وہ اپنے زمانے سے کس قدر آگے تھے۔

"ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کیچڑ تو نہیں رہا بلکہ شاعروں نے اُس کی طرف توجہ کی۔ ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے تھا، نہیں وہ بھی عمدہ مضامین ہیں اور جودتِ طبع اور تلاشِ

مضمون کے لیے نہایت مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھا۔ دوسری قسم کے مضامین جو در حقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذاتِ شعر میں داخل تھی۔ رجز و بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہ تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی"۔

سر سید کو فارسی اور اردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی اس غرض سے قائم کی کہ تاریخی اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی جائیں اور بقول مولانا حالی کے "اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا"۔ خود بھی دو کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا۔ ایک اردو لغات جسے لکھنا شروع کر دیا تھا اور اس کا نمونہ اپنے اخبار میں شائع کیا۔ دوسری اردو ادب کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا جو ابتدا سے اس وقت تک چھپی ہیں، نام، مصنف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرزِ بیان اور اس کی عبارت کے نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ درج ہوگا۔ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ اس سوسائٹی نے چالیس کتابیں شائع کیں۔ یہ سراسر اُنھیں کی کوشش اور توجہ کا نتیجہ تھا۔ افسوس کہ وہ دوسرے ایسے ضروری کاموں میں پھنس گئے کہ یہ کام ناتمام رہ گیا۔ البتہ "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" اور "تہذیب الاخلاق" نے اردو تحریر اور اسلوبِ بیان کی اصلاح میں بڑا کام کیا جس سے ادبی شان بڑھ گئی اور اس وقت جو ہم اپنی زبان میں ادبی اور علمی خیالات کے ادا کرنے کی صلاحیت دیکھتے ہیں وہ زیادہ تر اسی کا فیض ہے۔

۱۸۶۷ء میں سر سید نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی جانب سے (جس کے بانی اور سیکریٹری وہ خود تھے) ایک عرض داشت دربارۂ قیام "ورنیکلر یونی ورسٹی" گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجی۔ یہ بڑی اہم، دُور رس اور اصلاحی بلکہ انقلابی تحریک تھی۔ عرض داشت کی ابتدا میں تعلیم کی غرض و غایت بیان کی ہے اور اُس کی رو سے مروجہ طریقۂ تعلیم ناقص اور غیر کافی بتایا ہے:

> "جو گورنمنٹ سوا اُن غرضوں اور کسی قسم کی اور شاید اس کم تر خواہش کے سبب سے اپنی رعایا کی تعلیم پر آمادہ ہو کہ ان کو

صرف اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولی کاروبار کے انجام دینے کے لائق ہوجائیں تو وہ گورنمنٹ رعایا کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرے گی جو ایک آدمی اپنا بوجھ کھچوانے یا کوئی کام لینے کی غرض سے کسی جانور کے ساتھ اس کے سدھانے میں کرتا ہے"۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ:

"تعلیم جو اب ترقی کرنے سے تھکی ہوئی ہے اس کے کئی باعث ہیں جن میں سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے"۔ ایک ایسی غیر اور اجنبی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کی صراحت کی ہے"۔ مگر جس تجویز کو ہم گورنمنٹ اور لوگوں کے غور وفکر اور تصفیہ کرنے کے واسطے پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس حالت میں ہم انگریزی کی تعلیم قائم رکھیں اور اس کی ترقی میں کوشش کریں تو کیا ہم کسی دیسی زبان کو اس قسم کا ذریعہ اختیار اور تجویز نہیں کرسکتے جو ایک غیر ملک کی نسبت علم کے عموماً شائع ہونے اور لوگوں کے خیالات اور طور طریقے اور اخلاق کی ترمیم کے زیادہ تر مناسب ہو؟ کیا اہل یورپ کی روشن ضمیری اور شائستگی اور فضل وکمال کی تعلیم ایسی زبان ہے جس کی تحصیل ممکن نہیں کہ ہندوستان مقبوضۂ سرکار کے چودہ کروڑ باشندے کرلیویں بہتر اور عمدہ نہیں ہوسکتی؟ یہ ممکن نہیں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ایک ہی زبان اور وہ بھی نئی سکھائی جاسکے۔ یہ کب ہوسکتا ہے کہ ہم خداتعالیٰ کی اس قدرت کے برخلاف عمل کرسکیں جو بابل کے مینار پر اس نے دکھائی۔ پس اگر یہ بات ممکن نہیں تو بجز اس کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اہل یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم و فضل لوگوں کے علی العموم سکھانے کے لیے دیسی زبان کو ذریعہ ٹھیرایا جائے"۔

عرض داشت میں سول انجنیئرنگ کالج رُڑکی اور میڈیکل کالج آگرہ کی نظیر بھی پیش کی گئی۔ جہاں شاخِ اردو کے طالبِ علم اردو کے ذریعہ سے تعلیم پاتے ہیں۔ اُن کو وہی کتابیں جو انگریزی میں ہیں اردو میں ترجمہ کرکے پڑھائی جاتی ہیں۔ اردو کے طالب اپنے ہم سر انگریزی طالب علموں سے ان مضامین کی تحصیل میں پیچھے نہیں رہتے۔ بعض اوقات اردو فریق کا طالب علم اپنے ہم سر انگریزی طالب علم سے سبقت لے جاتا ہے۔

مقصد یہ تھا کہ یا تو اس غرض کے لیے یونی ورسٹی قائم کی جائے جس میں وہ تمام علوم و فنون جو کلکتہ یونی ورسٹی میں سکھائے جاتے ہیں، اس درس گاہ میں دیسی زبان کے ذریعہ سے پڑھائے جائیں۔ ویسے ہی امتحان ہوں جیسے کلکتہ یونی ورسٹی میں ہوتے ہیں اور اس کے طالب علموں کو ویسی ہی سندیں دی جائیں جو کلکتہ یونی ورسٹی کے کامیاب طلبہ کو دی جاتی ہیں یا کلکتہ یونی ورسٹی میں ایک شعبہ اسی غرض اور مقصد سے قایم کیا جائے۔ آخر میں بطور دفع مقدر یہ لکھا کہ "یہ بات البتہ سچ ہے کہ بالفعل ایسی کتابیں دیسی زبان میں موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے طالب علم اس درجے تک علم کی تحصیل کرسکے جو اب یونی ورسٹی میں امتحان دینے کے واسطے ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ایسی کتابوں کا موجود ہوجانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ جو کتابیں یونی ورسٹی کے امتحان کی فہرست میں مندرج ہیں ان کے ترجمے دیسی زبان میں تیار ہوسکتے ہیں اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ بہت سے عالم و فاضل اِس کام کے لائق موجود ہیں اور علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی اس کام کو انجام دے رہی ہے"۔

یوں تو گورنر جنرل نے اپنی خوشنودی اور ہمدردی کا بہت کچھ اظہار کیا لیکن جس امر کا اندیشہ تھا اور جس کے رفع کرنے کی عرض داشت کے آخر میں کوشش کی گئی تھی، جواب میں وہی لکھا ہوا آیا۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے۔ ۱۔ دیسی زبانوں میں ابھی اعلا درجے کی تعلیم کے لیے کافی سامان اور لوازمہ موجود نہیں ۲۔ صرف ان کتابوں کے تراجم جو یونی ورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اس قدر کافی نہ ہوں گے کہ جس کی بنا پر اس تجویز کو عمل میں لانے کی ہمت ہوسکے کیونکہ تعلیم یونی ورسٹی کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بعض خاص خاص کتب سے واقفیت ہوجائے بلکہ یہ مقصد ہے کہ یورپ کے علوم و فنون کے فراخ دائرے میں علم کی تحصیل کے لیے طبیعت کو

Marfat.com

مستعد اور تیار کیا جائے اور کچھ عرصے تک غالباً ہندوستان کے باشندے انگریزی کے ذریعہ سے اس بات کو حاصل کرسکتے ہیں۔ ۳۔ در صورت پسندیدہ ہونے کے بھی گورنمنٹ کے واسطے یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے گنجان آباد ملک کو جیسا کہ ہندوستان ہے کامل تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمے لے۔

اس عرض داشت میں بار بار یہ جتایا گیا ہے کہ اس تجویز سے ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں کہ انگریزی کے ذریعہ سے علوم و فنون کی جو تعلیم دی جاتی ہے اس میں کسی قسم کی کمی کی جائے بلکہ اسے ترقی دی جائے۔ ان کا یہ خدشہ وہم کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کہیں گورنمنٹ اس تجویز کی آڑ لے کر انگریزی کی اعلا تعلیم کو بند نہ کردے یا انگریزی زبان کو ثانوی حیثیت دے کر سارا زور مشرقی زبانوں اور مشرقی علوم کی تعلیم میں نہ صرف کردے۔ چنانچہ جب لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات پر جو تقریریں کیں اور اس کے بعد لارڈ رپن نے ایڈریس کے جواب میں جو تقریر کی ان میں مشرقی زبانوں اور علوم کی تعلیم کو خوب سراہا۔ لارڈ رپن کی تقریر میں یہ الفاظ تھے کہ "ترقی و اشاعتِ زبان ہائے مشرقی و علوم مشرقی نہایت کارِ احسن ہے" وغیرہ وغیرہ، تو سرسید کا یہ احتمال قوی ہوگیا کہ گورنمنٹ کی نیت اچھی نہیں اور اگر پنجاب یونی ورسٹی کا درجہ اور اختیارات مل گئے تو پنجاب میں اعلا تعلیم کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اس بنا پر اُنھوں نے بڑے سخت اور زبردست آرٹیکل اس کی مخالفت میں لکھے۔ اسی طرح جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ الہ آباد یونی ورسٹی بھی اسی ڈھنگ پر بننے والی ہے تو انھوں نے اس کی پُرزور مخالفت کی اور لکھا کہ اگر ایسا ہے "تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اس کا جواب صاف ہے۔ استقلال، استقلال، استقلال۔ ہمت، ہمت، ہمت۔ کوشش، کوشش، کوشش۔ ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سیلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائے پر نہیں"۔ یہی شبہ انھیں اس معاملے میں ہوا اور یہ سن گن پاکر کہ گورنمنٹ کا منشا، کلکتہ یونی ورسٹی کو توڑ کر ورنا کیولر یونی ورسٹی قائم کرنے کا ہے اور انگریزی زبان کی اس میں ثانوی حیثیت ہوگی، اس سے ان کا جوش دھیما پڑ گیا۔ کچھ اور حالات بھی ایسے واقع ہوئے کہ یہ کارروائی آگے نہ بڑھ سکی۔

Marfat.com

"ورنیکلر" سے سرسید اور اُن کے رفقا یعنی ارکانِ برٹش انڈین ایسوسی ایشن و ارکانِ سائنٹفک سوسائٹی کی (جس میں ہندوستانی اور انگریز سب شریک تھے) کی مراد اردو زبان تھی۔ کیوں کہ ہندی زبان کی حیثیت اُس وقت ایسی نہ تھی کہ اس بار کی متحمل ہو سکتی۔ عرض داشت کے اُس فقرے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے جس میں سائنٹفک سوسائٹی کے ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے قبل اس کا تجربہ دہلی کالج میں ہو چکا تھا جہاں سب علوم و فنون کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور جتنے ترجمے اور تالیفات وہاں ہوئیں وہ سب اردو میں تھیں، نیز سوال انجنیئرنگ کالج رُڑکی اور میڈیکل کالج آگرہ میں اردو فریق کے طلبا کو نصاب کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کر کے پڑھایا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جواب آنے پر اعلا تعلیم یافتہ ہندوستانیوں مثلاً مولوی ذکاءاللہ، ماسٹر پیارے لال پنڈت دھرم نرائن نے انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی ہامی بھری تھی۔

ملک کی بد نصیبی دیکھیے کہ ابھی یہ تجویز معرض بحث میں تھی اور اس کی منظوری اور عمل میں آنے کی بھی کچھ زیادہ توقع نہ تھی کہ زبان کے معاملے میں اختلاف شروع ہو گیا اور اخباروں میں ہندی اردو کی چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ ہندی والے خود بھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ ہندی میں اس قسم کے ترجموں کی صلاحیت نہیں ہے تاہم وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ اُسے ترقی دینے کی کوشش کر کے ترجمے کے قابل بنایا جائے اور اس یونی ورسٹی میں مسلمانوں کو اردو میں اور ہندوؤں کو ہندی میں تعلیم دی جائے، کیا یہ دو قومی نظریہ نہیں ہے؟

اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے ایک بار پھر کوشش کی۔ کمیٹی خواست گار ترقیِ تعلیم مسلمانان کی ایک منتخب کمیٹی میں ایک بڑی طویل تجویز تعلیم مسلمانان کے متعلق پیش کی۔ اس میں مدرستہ العلوم (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کے قائم کرنے کا بھی ذکر تھا۔ انھوں نے بیان کیا کہ "یہ درحقیقت تین مدرسوں پر مشتمل ہوگا۔ اول انگریزی، دوم اردو، سوم عربی فارسی"۔ اردو مدرسہ کے متعلق یہ تجویز پیش کی:

> "اس میں تمام علوم و فنون بزبانِ اردو پڑھائیں گے اور جو کچھ تعلیم اس میں ہوگی وہ سب اردو میں ہوگی۔ البتہ ہر طالب علم کو تین زبانوں میں سے ایک زبان بطور سیکنڈ لینگویج کے اختیار

Marfat.com

کرنی ہوگی، انگریزی، فارسی، عربی۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جو لڑکا دس بارہ برس کی عمر میں اس مدرسہ میں داخل ہوگا وہ ضرور اٹھارہ برس کی عمر تک تمام سائنس یعنی علوم کو اردو زبان میں اس قدر تحصیل کرلے گا جس قدر کہ درجہ بی۔ اے کے لیے مقرر ہیں۔ یہ مدرسہ جو اس قسم کا تجویز کیا گیا ہے جس میں تمام علوم اردو زبان میں پڑھائے جائیں گے اس کا سبب یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی مدرسوں میں کافی لیاقت لڑکوں کو نہیں آتی۔ ایک مشکل ان کو غیر زبان کا سیکھنا اور دوسری مشکل غیر زبان میں علوم کا سیکھنا ہوتا ہے۔ پس اس تدبیر سے ہم نے اُن کی ایک مشکل کو موقوف کردیا ہے تاکہ وہ بہ سبب اپنی زبان کے علوم و فنون سے نہایت جلد بخوبی واقف ہوجائیں اور بعد اس کے دوسری زبان کے لٹریچر میں محنت کرکے جہاں تک اُن سے ہوسکے ترقی کرلیں۔ اس تدبیر سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بہت کم طالب علم علوم و فنون سے گو کہ وہ اردو زبان ہی میں کیوں نہ ہوں ناواقف رہیں گے اور بہ نسبت حال کے لٹریچر پر محنت کرنے کی زیادہ مہلت ملے گی اور اُن کو اس زبان کی لٹریچر بہ نسبت حال کے بہت زیادہ آجائے گی"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر یہ تجویز نظرانداز کردی گئی اور اس تجربہ کا موقع نہ ملا مگر اس سے بہرحال ان کے اس خیال کا کافی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو کے ذریعہ سے تعلیم دینا کس قدر ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب یہ بحث آئی کہ کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے کالجوں کی تعلیم سے وہ لیاقت حاصل نہیں ہوتی جو انگلستان کے کالجوں کی تعلیم سے ہوتی ہے۔ اس کا جواب سرسید نے یہی دیا کہ وہاں ذریعہ تعلیم مادری زبان ہے اور یہاں ایک غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے جس پر قدرت حاصل کرنے میں بہت مشکل پیش آتی ہے اور "اس پر قادر ہونے تک تمام وقت تحصیل علوم و فنون کا گزر جاتا ہے"۔

اردو کی حمایت میں سرسید نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ جب کبھی اردو پر آنچ

آتی دیکھی تو وہ اس کی حمایت کے لیے فوراً کمر بستہ ہوگئے۔ ۱۸۶۷ء میں بعض سر بر آوردہ ہندوؤں کو تمام سرکاری دفتروں اور عدالتوں اور مدرسوں سے اردو زبان اور اردو رسم الخط کو خارج کرنے اور اس کی بجائے ہندی بھاشا اور ناگری رسم خط رائج کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ دوسرے سال اس غرض کے لیے جابجا کمیٹیاں، مجلسیں اور سبھائیں قائم ہوئیں اور صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی اور بابو سرودا پرشاد سنڈیال اس کے سیکریٹری بنائے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اس پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ اخبار "سائنٹفک سوسائٹی "علی گڑھ، "بنارس گزٹ"، رسالہ "جلسہ تہذیب" لکھنؤ "ایجوکیشن گزٹ"، "نورالابصار" وغیرہ میں دونوں طرف سے سخت اور پُرجوش مضامین شائع ہوئے اور اچھا خاصا مناظرے کا رنگ پیدا ہوگیا۔ بابو سرودا پرشاد اور سید احمد خاں میں اس موضوع پر مراسلت بھی ہوئی۔

ادھر یہ کھچڑی پک رہی تھی کہ بہار میں بم کا گولہ پھٹا۔ ۷ نومبر ۱۸۷۱ء کو مظفرپور کے سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے مسٹر جی کمبل لفٹننٹ گورنر بنگال کو مدعو کیا گیا۔ اُن کے آنے پر تین تقریریں ہوئیں۔ مولوی سید امداد علی نے اردو میں اور ڈاکٹر فیلن اور کیمبل نے انگریزی میں تقریر کی۔ ظاہر ہے کہ سپاس ناموں اور اس قسم کی مدحیہ تقریروں میں عربی، فارسی الفاظ کے بغیر چارہ نہیں۔ اس پر لفٹننٹ گورنر نے مولوی سید امداد علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ چونکہ میں اس زبان سے ناواقف ہوں اس لیے تقریر کا بہت کم حصہ سمجھ سکا اور مشکل سے یہ فرق کرسکا کہ ان کی تقریر اردو زبان میں تھی یا فارسی میں۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو دیسی زبان نہیں اور تعلیم عامہ میں اسے رواج نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے بعد انھوں نے ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو ایک عجیب و غریب سرکاری یادداشت شائع کی جو جہالت و تعصب اور بدتمیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

> "فارسی زبان کو جو ہندوستان کے قدیم حکمرانوں کی زبان تھی ترک کردیا گیا ہے۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے ہندوستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کردی گئی تھی۔ میری ملازمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ

سرکاری قوانین میں اس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ہوں جو فارسی انشا پردازوں کو بہت عزیز تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ زبان متروک ہو چکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بہار میں جو زبان میں نے سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی۔ ایسی مصنوعی زبان میں نے کبھی نہیں سُنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان کہا جاتا ہے۔ مولوی لوگ جو زبان مروجہ زبان کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں۔ اس زبان کے لیے اردو کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نہایت غیر موزوں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ بنگال کے محکمۂ تعلیمات نے رائج کیا ہے۔ یہ ایسا لفظ ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جا سکتے۔ کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کچھ لکھیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان، اہل دربار اور دلی کی طوائفوں کی زبان ہے۔ اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے، روکنے کی کوشش کروں گا۔ میں فارسی زبان کے مداحوں میں ہوں۔ یہ ایک نفیس اور پُرتکلف زبان ہے۔ اگر فارسی زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، بشرطیکہ حالات ایسے کرنے کے موافق ہوں۔ لیکن بگڑی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے میل جول سے جو زبان تیار کی گئی ہے جس میں ہندوستانی کے کچھ تھوڑے سے افعال و حروف ہجائیہ شامل کر لیے گئے جسے اردو کہتے ہیں،

Marfat.com

ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی تعلیم دی جائے..... مصنوعی زبانیں سکھانے سے کچھ فائدہ نہیں جنھیں عام لوگ نہیں بولتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔

میں ڈائرکٹر تعلیمات کی توجہ مندرجہ ذیل اُمور کی طرف مبذول کراتا ہوں۔

"۱۔ اردو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی طور پر متروک ہوچکی ہے۔

۲۔ ڈائرکٹر تعلیمات اور انسپکٹر ان مدارس کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جاچکا ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں لکھتے ہیں "میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دفاتر میں سوا مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ کریں۔ الاّ انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہے وہ علیٰ حالہ رہے گی۔ مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ کے جج میری طرح دیسی زبانوں کے غلط استعمال کے خلاف ہوں گے"۔

یہ شخص اردو کو دوغلی زبان کہتا ہے حالانکہ اُس کی مادری زبان دنیا بھر کی زبانوں میں سب سے زیادہ دوغلی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے (یہ میرا قیاس ہے) کہ ڈاکٹر فیلن انسپکٹر مدارس اور انٹنی میکڈانل نے جو اُس وقت بہار میں کلکٹر تھے، لفٹنٹ گورنر کے کان بھرے۔ یہ دونوں ہندی کے حامی تھے۔ ڈاکٹر فیلن نے اپنی ہندوستانی ڈکشنری میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چُن چُن کر اور اپنے گماشتوں کے ذریعہ تلاش کروا کروا کر بڑے اہتمام سے فحش اور سوقیانہ الفاظ اور محاورے جمع کیے ہیں۔ یہی نہیں کہ جو لفظ درحقیقت فحش ہیں وہی لکھے ہوں بلکہ ایسے معمولی روزمرّہ کے لفظ اور محاورے بھی جو مجازاً، کنایتہً، طنزاً یا کسی نہ کسی صورت سے فحش معنوں میں آسکتے ہیں، اُنھوں نے بڑی باریک بینی سے ایسے معنی بھی درج فرما[illegible] مقصد اردو کو سوقیانہ زبان

ثابت کرنا اور بدنام کرنا تھا۔ دوسرے انٹنی میکڈانل وہ بزرگ ہیں کہ جب وہ یو۔ پی کے لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے تو سب سے پہلے اردو پر ہاتھ صاف کیا۔ اُن کے عہد حکومت کا بڑا کارنامہ یہی ہے۔ غرض مسلمانوں اور بعض پرانی وضع کے ہندوؤں نے بہت کچھ واویلا کیا مگر شنوائی نہ ہوئی۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو منظم طور سے احتجاج کرنا اور ہلچل مچانا نہ پہلے آتا تھا اور نہ اب آتا ہے اِس لیے ہمیشہ خسارے میں رہے۔

جب سرسید نے دیکھا کہ بات بڑھتی جارہی ہے اور ہندو اپنی کوششوں میں برابر لگے ہوئے ہیں تو الہ آباد میں ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو اُردو کی حمایت میں ایک جلسہ ہوا۔ اور ہندی کی تحریک کو روکنے کے لیے ایک صدر کمیٹی الہ آباد میں بنائی گئی جس کے سیکریٹری سید احمد خاں قرار پائے۔ صدر کمیٹی کی طرف سے ایک سرکلر صوبہ شمال مغرب کے ہر ضلع میں بھیجنے کے لیے تیار کیا گیا۔ اس سرکلر میں اُن نقصانات کی تفصیل تھی جو اُردو کو خارج کرنے اور اس کے بجائے ہندی کو رائج کرنے سے ہوں گے۔ نیز اس جلسے میں ایک تجویز یہ ہوئی کہ ہر ضلع میں ماتحت کمیٹیاں اس غرض سے بنائی جائیں۔ مسلمانوں کی طرف سے تو اس معاملہ میں کچھ زیادہ جوش خروش کا اظہار نہ ہوا، لیکن الہ آباد کی ہندی صدر مجلس نے منظم طور پر اپنی کوششوں کو شدومد سے جاری رکھا اور ہزارہا ہندوؤں کے دستخطوں سے بڑے بڑے محضر گورنمنٹ میں پیش کیے۔ ڈائرکٹر تعلیمات نے اس کمیٹی کی تائید کی مگر اُس وقت اس بنا پر کچھ کامیابی نہ ہوئی کہ اردو زبان اور اس کا رسم خط ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم خط کی نسبت بہت زیادہ مروج تھا۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کے بعد جب قومی خدمت شروع کی تو جتنے کام کیے اُن میں کبھی ہندو مسلم کا امتیاز نہ کیا اور نہ کبھی اس کا خیال آیا۔ مثلاً مراد آباد اور غازی پور میں مدرسے قائم کیے۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور اس قسم کے جو جو کام کیے وہ سب کے لیے تھے اور ان میں ہندو مسلمان دونوں برابر شریک تھے اور ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ اُنھوں نے اپنی تقریروں میں بارہا اس خیال کو بڑے خلوص اور پُراثر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہاں میں صرف دو ایک اقتباس درج کرتا ہوں:

"اے ہندو اور مسلمانوں! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والو ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین

Marfat.com

میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے"۔

(تقریر گورداسپور ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء)

"میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں اس کہنے کو بھی پسند نہیں کرتا کیونکہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسری کو بائیں آنکھ کہیں گے۔ مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں۔ اے کاش میرے صرف ایک آنکھ ہی ہوتی کہ اُس حالت میں عمدگی کے ساتھ اُن کو اُس ایک آنکھ کے ساتھ تشبیہہ دے سکتا"۔

"اے میرے دوستو! میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہوجائے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کردیں گے تو وہ کانڑی بن جائے گی۔ پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اُس دلہن کو بھینگا بناؤ چاہو کانڑا"۔

"ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں۔ ایک دریا کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتا ہے۔ ایک کو

Marfat.com

دوسرے کے بغیر چارہ نہیں، پس کسی چیز کو جو معاشرت سے تعلق رکھتی ہے دونوں کا علاحدہ علاحدہ رہنا دونوں کو برباد کردینا ہے"۔

"اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوگئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کرلیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان پیدا کرلی جو نہ ہماری زبان تھی نہ اُن کی"۔

"میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں کہ اُن کا (یعنی ہندو مسلمان کا) مذہبی عقیدہ کیا ہے، کیونکہ ہم اُس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں، یہی مختلف وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کی جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم"۔

ان اقوال سے ظاہر ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے کس قدر حامی تھے۔ تقریر و تحریر میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے بوئے تعصب آتی ہو یا ہندوؤں کی دل آزاری کا باعث ہو، بلکہ ان کے بزرگوں اور لیڈروں کا ذکر ہمیشہ ادب و احترام سے کیا اور ان کے مرنے پر کمال رنج و افسوس کا اظہار کیا۔ اپنی تقریروں اور مضامین میں بار

Marfat.com

بار باہمی اتحاد کی، تلقین کی اور یہ سمجھایا کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں اور بھائی بھائی کی طرح مل کر کام کریں۔ گائے کی قربانی کا معاملہ ایسا ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں جگہ جگہ دنگے فساد اور خرابہ ہوا اور اب تک یہ جھگڑا چلا آرہا ہے۔ مسلمان اسے اپنا مذہبی حق سمجھتے ہیں اور اس میں مداخلت یا ممانعت کو گوارا نہیں کرتے۔ لیکن سرسید نے نہایت صاف دلی اور آزادی سے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ یہ صرف خالی خولی زبانی باتیں نہ تھیں بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا۔ چنانچہ ایک سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے شریک ہو کر ایک گائے قربانی کے لیے خریدی۔ عین بقرعید کے دن نمازِ عید کے بعد سرسید کو خبر ہوئی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سُن کر وہ ازخود رفتہ ہوگئے۔ فوراً سوار ہونے کے لیے گاڑی تیار کرائی اور لپسنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ایک ڈاک لگادی یہاں تک کہ وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اُس کے مالک کو واپس کردی گئی اور طالب علموں کو سخت ملامت کی اور آئندہ کے لیے قطعی ممانعت کردی کہ کالج کے احاطے میں کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔ اس سے بڑھ کر صلح جوئی اور آشتی پسندی کیا ہو سکتی ہے۔

لیکن جب ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اردو کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی تو سرسید کے دل کو بڑی ٹھیس لگی اور بہت صدمہ ہوا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سرسید کہتے تھے کہ:

"یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمانوں کو بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے ان کا بیان ہے کہ "اُنھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سُن رہے تھے۔ آخر اُنھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں

Marfat.com

نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے"۔

اپنے اس خیال کو اُنھوں نے علی گڑھ کی تعلیمی سروے رپورٹ میں بھی ایک جگہ اِن الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اُس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کی کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشہیِ ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹادیا جائے اُس وقت سے مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہوکر ملک کی ترقی اور اُس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے۔ میں نہایت دُرستی اور اپنے تجربہ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اُس کی ابتدا اسی سے ہوئی"۔

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ہندو مسلم نزاع یہیں سے شروع ہوتی ہے اور دو قومی نظریہ کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔ عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہندو مسلم تنازع سیاسی ہے اور سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کرکے اس کی بنیاد ڈالی۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اُس کی بنیاد اس وقت پڑی جب ہندوؤں نے اردو کو مٹانے کی

Marfat.com

کوشش کی اور یہ کوشش برابر جاری رہی۔ چنانچہ جب سر انٹنی میکڈانل جو بہار میں گل کھلا چکے تھے یو۔پی کے لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے تو ہندی والوں کی بن آئی اور باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا۔ اس واقعہ کو مولانا حالی نے "حیات جاوید" میں بیان کیا ہے۔ یہاں میں اُنھیں کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دُنیا سے رحلت کی، سر انٹنی میکڈانل لفٹنٹ گورنر اصلاع شمال مغرب و اودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گزرانا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی رسم خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانے میں ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتے کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر آرٹیکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اُس کو اس باب میں بذریعۂ تحریر کے کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہوسکتا لیکن جہاں تک ممکن ہوگا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ ان کو یقین ہوگیا تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لیے وہ اپنے ہندو دوستوں کی ناراضی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے جس طرح وہ ہندوستانیوں کے انگریزی لباس اور انگریزی طرز معاشرت پر انگریزوں کے اعتراضات کو ہمیشہ ان کی تنگ دلی اور غرور پر محمول کرتے تھے اور کبھی اُن کے اعتراضوں کا جواب دینے سے نہ چوکتے تھے اسی طرح انھوں نے اردو کی مخالفت پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو بھی ادا کیے بغیر نہ رہے۔ وہ

Marfat.com

اپنے آرٹیکل کے شروع میں لکھتے ہیں کہ "غالباً اس وقت اُن کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبے کے لفٹننٹ گورنر بہادر اُس زمانے میں جب کہ صوبہ بہار میں کیتھی حرف اور بہاری زبان بہ عوض اردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر اور مجسٹریٹ معاون اس تجویز کے تھے۔ پس اِن صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہونے میں تامل نہ فرمائیں گے اور شاید یہ غلط خیال بھی اُسی پرانے مردہ مضمون کے اُٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ اُن کو ناشکرا سمجھتی ہے"۔ اُس کے بعد اُنھوں نے میمورِیل کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترجیح کی دلیلیں پیش کی ہیں۔ اگرچہ اس وقت ہنر آنر نے کورٹ کی زبان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی تھی مگر جو کچھ انھوں نے میمورِیل کے جواب میں فرمایا اُس سے صاف پایا جاتا تھا کہ آئندہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔ چنانچہ سرسید کے انتقال کے بعد ۱۸ اپریل ۱۸۹۸ء کو وہ مشہور ریزولیوشن پاس ہوا جو دونوں قوموں کو سر انٹنی میکڈانل کا عہد حکومت ہمیشہ یاد دلائے گا"۔

یہ صرف میکڈانل کے عہد جبروت عہد ہی کو نہیں یاد دلاتا بلکہ اس نے ہندوؤں کے دو قومی نظریہ پر بھی مہر ثبت کردی۔ ڈیپوٹیشن کو جواب دیتے ہوئے ہنر آنر نے موجودہ دستور عدالت میں جلد تبادلے کو ناپسند کرکے جس کے افسران گورنمنٹ عادی نہیں ہیں قبول کیا کہ سرکاری کاغذات میں ناگری حروف کے مزید استعمال سے فائدہ حاصل ہوسکتا ہے"۔ مطلب صاف ظاہر ہے کہ گھبراؤ نہیں۔ درِ اجابت باز ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ نیرنگی تقدیر سے جو اس کی جان کے لاگو تھے وہی اس کے آقا بن گئے اور اُنھوں نے اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو کسی زمانہ میں بدھ مت والوں اور ان کی زبان پالی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ سنتِ قدیم ہے۔

Marfat.com

سرسید اردو کی حمایت کو اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اہم قومی خدمت سمجھتے تھے اور اس معاملے میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہ کی بلکہ سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا۔ لیکن علمی و ادبی اعتبار سے بھی اردو زبان میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔ ان کا ذوق ادب ایسا اچھا تھا کہ اگر وہ دوسرے بکھیڑوں میں نہ پڑجاتے تو اردو کے بہت بڑے ادیب ہوتے۔ اب بھی اگر ان کی ضخیم تصانیف اور بے شمار تحریروں میں سے صرف ادبی نقطہ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو یہ انتخاب ہماری زبان و ادب کا بے مثل شاہکار ہوگا۔ یہ ادبی ذوق ہی تو تھا جس نے قیام سائنٹفک سوسائٹی کے بعد انھیں اردو لغات اور اردو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کی تحریروں میں تو اکثر جگہ ادبی جواہر ریزے اور حُسن بیان کے چمکارے، ٹھیٹ زبان کے الفاظ اور محاورے اور مزاح و ظرافت کی پھلجڑیاں نظر آئیں گی، لیکن جب کبھی اپنے روزمرہ کے اشغال و افکار سے فارغ ہوتے خصوصاً رات کے کھانے کے بعد اور کوئی علمی یا ادبی گفتگو آجاتی تو اس میں بھی بعض اوقات کوئی نکتے کی بات کہہ جاتے تھے۔ ایک دن مولانا شبلی نے قرآن مجید کا کوئی لفظ یا جملہ (افسوس اس وقت مجھے بالکل یاد نہیں رہا) پڑھا اور کہا کہ شاہ عبدالقادر نے اس کا کیا اچھا ترجمہ کیا ہے "اور بات تو یہ ہے"۔ سید صاحب نے فرمایا اس سے بھی مختصر اور بہتر ہوسکتا ہے۔ مولانا نے پوچھا وہ کیوں کر۔ فرمایا "اور ہے تو یہ" مولانا قائل ہوگئے۔ ایک بار ظفر اور ذوق پر گفتگو چھڑ گئی اور وہی پُرانی بحث دہرائی گئی کہ ظفر کے سب دیوان ذوق کے لکھے ہوئے ہیں۔ سید صاحب اس پر ذرا چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا، قلعہ کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آگئی۔

مولوی عبدالرزاق (مصنف البرامکہ) اپنی کتاب "یاد ایام" میں لکھتے ہیں "سرسید کی صحبت نہایت دلچسپ ہوتی تھی شب کے کھانے پر نہایت اطمینان سے گفتگو ہوا کرتی تھی..... مولانا شبلی اکثر کھانے پر تاریخی واقعات اور سلاطین مغلیہ وغیرہ کے حالات دریافت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا نے داغ کا ایک شعر پڑھا جس میں سلاطین کی جمع سلاطینوں آئی تھی۔ اُس پر میرے دوست نے داغ کا مضحکہ اڑایا۔ سرسید سُن کر چُپ ہورہے۔ جب دوبارہ یہ بحث شروع ہوئی تو فرمایا سلطان کی جمع عربی میں سلاطین آتی ہے۔ لیکن اس شعر میں سلاطین سے (قلعہ معلیٰ کی اصطلاح کے مطابق) دوسرے معنی مراد ہیں۔ تب مولانا نے عرض کیا کہ تفصیل سے ارشاد فرمایئے،

Marfat.com

میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ دو ولی عہد کے علاوہ جس قدر تیموری شہزادے قلعۂ معلیٰ میں تھے ان میں سے ہر ایک کا لقب سلاطین تھا۔ اس سبب سے سلاطین کی جمع سلاطینوں صحیح ہے۔ داغ نے قلعہ معلیٰ میں عہد طفلی سے جوانی تک تعلیم و تربیت پائی تھی، لہذا اس کا کلام مستند ہے"۔

سر سید بلا کے کام کرنے والے تھے۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے۔ اخبار اور "تہذیب الاخلاق" کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے۔ معترضین کے جواب بھی دیتے تھے کالج کے حساب کتاب اور دوسرے اہم کاموں اور عمارتوں کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ رپورٹیں تیار کرتے اور اڈریس لکھتے، لیجس لیٹو کونسل کی ممبری کے زمانے میں تقریریں تیار کرتے۔ خطوں کے جواب لکھتے یا لکھواتے۔ ملاقاتیوں سے ملتے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسرے جلسوں کا انتظام کرتے۔ کس کس کام کا ذکر کیا جائے۔ کاموں کا ایک ہجوم تھا جسے وہ استقلال اور اطمینان سے صبح سے لے کر شام تک برابر کرتے تھے۔ بڑھاپے کے زمانے میں بھی ان کے انہماک اور محنت کا یہی حال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے ہی سے انسان بنتا ہے اور اسی سے اس کی سیرت بنتی ہے اور اس سے اس کے دماغی اور اخلاقی قوا کی جلا ہوتی ہے۔ اس سے مراد وہ کام ہے جس کے کرنے میں انسان کو لذت ملے اور شوق اُسے اور اُبھارے۔ ورنہ کام کام نہیں رہتا بیگار ہوجاتی ہے۔ سر سید کا یہی حال تھا کہ وہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام ایسے شوق اور تن دہی سے کرتے تھے گویا ان کی دنیا اور عاقبت کا انحصار اسی پر ہے۔ ہمیں بہت ہی بڑے بڑے لوگوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن سر سید کی شان ہی کچھ اور تھی۔ ان کا دروازہ سب کے لیے کھلا تھا۔ ملاقاتیوں سے باتیں بھی کر رہے ہیں۔ جمع خرچ کی جانچ بھی ہو رہی ہے۔ علمی کام بھی ساتھ ساتھ ہو رہا ہے۔ بجٹ بھی مرتب کیا جا رہا ہے۔ خط بھی لکھے یا لکھوائے جا رہے ہیں، ہنسی چہل کی باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ پروف بھی پڑھ رہے ہیں۔ مضمون بھی لکھوا رہے ہیں یہ سب کچھ ہوتا ہے اور پیشانی پر میل نہیں آتا۔ ایک بات پر مجھے بڑی حیرت تھی۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں لیجس لیٹو کونسل کا ممبر انتخاب کیا تھا۔ کونسل میں تمام تقریریں انگریزی میں ہوتی تھیں اور یہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ کونسل کے معاملات کے تمام کاغذات جو سراسر انگریزی میں ہوتے تھے پڑھوا کر اور

ترجمہ کروا کر سنتے اور ان کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرتے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ کونسل میں جا کر انگریزی میں تقریر کیوں کر کرتے تھے اس کی انھوں نے عجیب ترکیب نکالی تھی۔ پہلے وہ اپنی تقریر اردو میں لکھتے، اس کے بعد اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کراتے۔ پھر اس انگریزی تقریر کو اردو حروف میں لکھتے اور کونسل میں جا کر پڑھ دیتے۔ یہ کام ایسا بے مزہ اور اُکتا دینے والا تھا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی کا بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن وہ اس سے مطلق نہ گھبراتے۔ لطف یہ ہے کہ یہ تقریریں معمولی اور وقت گزارنے کے لیے نہیں تھیں۔ ان میں بعض بڑے معرکہ کی تھیں۔ ایک بار جب کونسل کے اجلاس کے ختم پر وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو لارڈ لیٹن اُن کے پیچھے پیچھے چلے آئے اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ "میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سنی تھی"

قومی خدمت میں منہمک ہونے سے قبل بھی ان کا یہی حال تھا، اُن کی اخلاقی جرأت، آزادی خیال، رواداری، انصاف پسندی، بے تعصبی، فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مسلمان سب قائل تھے۔ جس کام کو اُنھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اُسے کامل خلوص اور تن دہی سے انجام دیا۔ جب قومی خدمت کا بار اپنے سر لیا تو یہ شغف اور بڑھ گیا۔ اِس دھن میں وہ سب کچھ بھول گئے۔ فرہاد کو شیریں سے اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا اُنھیں اپنی قوم سے تھا۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے یہی ان کا ورد تھا۔ وہ بلامبالغہ فنا فی القوم کے درجے کو پہنچ گئے تھے۔ سید نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سید، شیخ، مغل، پٹھان تھی۔ سید نے اسے "نیشن" کا ہم معنی بنا دیا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا۔

شروع میں ایک مدت تک وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم کہتے اور سمجھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے بار بار اپنی تقریروں اور تحریروں میں کیا ہے۔ لیکن جب ہمارے ہندو بھائیوں نے اردو کی مخالفت کر کے دو قومی نظریے کی بنیاد ڈالی تو انھیں سخت رنج ہوا اور انھوں نے ناچار اپنی کوششوں کا رخ مسلمانوں کی فلاح و تعلیم کی طرف پھیر دیا۔ یہیں سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہو گئیں۔ ہندو سماج کا عمل دو قومی کیا صد قومی نظریے پر ہے۔ میرے مرحوم دوست سیٹھ یعقوب حسن جو کانگریس کے اول درجے کے پرستاروں اور لیڈروں میں سے تھے مجھ سے بیان کرتے

Marfat.com

تھے کہ جب یہ معلوم ہوا کہ مسٹر گوکھلے مدراس تشریف لانے وا۔ لہیں تو میں نے انھیں ایک بڑے ہوٹل میں ڈنر دینے کی سوچی اور اس تجویز کو اپنے احباب کے سامنے پیش کیا۔ وہ کہتے تھے کہ سب سے زیادہ مشکل مجھے ہندو احباب کو رضامند کرنے میں پیش آئی۔ جب میں نے اُن سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منھ تکتے تھے کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سب ایک میز پر ایک ساتھ کھانا کھائیں۔ میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ کھانے میں گوشت یا کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جس سے ہندوؤں کو پرہیز ہے۔ پکانے والے بھی ایسے ہوں گے جن کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانوں کے کھانے میں کسی ہندو کو عذر نہ ہوگا۔ غرض بار بار کے سمجھانے بجھانے اور بحث و تکرار کے بعد کچھ تو رضامند ہوگئے اور کچھ نے یہ کہا کہ کھانے کے وقت ہم باہر بیٹھے رہیں گے اور جب کھانا ختم ہوجائے گا تو اندر آجائیں گے۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھے۔ خیر سے یہ سب اعلا تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصحاب تھے۔ مرحوم کہتے تھے کہ جب ڈنر کا دن آیا تو جگہ جگہ سے ٹیلی فون آئے کہ ڈنر کے وقت کیسے کپڑے پہنیں اور کیا کیا پہنیں۔ میں ایک ایک کو سمجھاتا اور بتاتا تھا مگر بعض اس پر بھی نہ سمجھے تو میں نے اُن کے گھر جا جا کر اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے۔ اب ڈنر شروع ہوا۔ ایک گروہ باہر بیٹھا ہوا انتظار کرتا رہا۔ ڈنر ختم ہوتے ہی یہ مقدس جماعت دبے پاؤں ہال میں براجمان ہوئی لیکن کم بختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ابھی بیٹھنے ہی پائے تھے کہ اتنے میں آئس کریم آئی اور ہر ایک کے سامنے رکھی گئی۔ یہ حضرات بہت جز بز ہوئے اور ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔ کچھ کھس پھس بھی ہوئی۔ بہت بُرے پھنسے، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ بعض نے شرما شرمی ایک دو چمچے زہر مار کی۔ باقیوں نے چھوئی تک نہیں اور آنکھیں نیچی کیے بیٹھے رہے۔ اب انھیں کون قوم کہہ سکتا ہے؟ یا کوئی دوسری جماعت ان سے مل کر قوم بننے کا شرف کیوں کر حاصل کرسکتی ہے؟ یہ دوسروں کو مٹا دینا یا ہضم کرنا جانتے ہیں، بیچ کا کوئی رستہ ان کے ہاں نہیں ہے۔

سرسید نے ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنے اور مل کر کام کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد بھی مسلم لیڈروں نے اس خیال کو ترک نہیں کیا اور کامل خلوص اور رواداری سے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیتے رہے۔ لیکن آخر ہندوؤں کی ناروا داری اور تنگ نظری سے تنگ آکر یکے بعد دیگرے سب الگ ہوگئے اور ان کو

بھی وہی کہنا پڑا جو سید نے مجبور ہو کر کہا تھا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں نہایت المناک سانحہ ہے اور ناروا داری، سیاسی ناداری اور کوتاہ اندیشی کا سب سے بڑا واقعہ۔

دلّی میں سرسید کا خاندان بہت شریف اور عالی خاندان تھا۔ اُس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک شریف انسان میں ہونی چاہئیں۔ گھر میں ان کی تربیت والدہ کی زیر نگرانی ہوئی اور یہ ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اسلامی اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اُس فرزانہ اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے ان کے دل میں بٹھا دیے تھے وہ عمر بھر نہ بھولے اور اُن پر عامل رہے۔ بڑے ہو کر جو صحبت ملی وہ اُس زمانے کی بہترین افراد کی تھی۔ ان میں سے ہر ایک جوہر قابل تھا۔ ان کے نام اب تک ہمارے ادب میں عزت سے لیے جاتے ہیں۔ اگرچہ اُن کی تعلیم اعلا درجے کی نہیں ہوئی تھی لیکن تربیت اور صحبت بڑی چیز ہے۔ علم سے لگاؤ تھا۔ اہل علم اور ارباب سخن کی صحبت نے صحیح ذوق پیدا کیا۔ مطالعہ کا شوق پہلے سے تھا۔ غور و فکر اور نکتہ رسی کا ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ ان سب کے بل پر اُنھوں نے وہ وہ کام کیے جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

سرسید کے خاندان کا تعلق قلعہ سے ایک زمانے سے چلا آرہا تھا۔ قلعہ سے جو تنخواہیں ان کے والد کو ملتی تھیں اُن سے اچھی خاصی بسر اوقات ہوجاتی تھی۔ لیکن حالات بدل گئے تھے۔ ان تنخواہوں میں کتر بیونت شروع ہوئی۔ اس لیے اُن کو قلعہ سے قطع تعلق کرنا پڑا اور سرکار انگریزی کی ملازمت اختیار کرنی پڑی اس وقت ان کی عمر تقریباً بائیس سال کی تھی۔ ابتدا میں انھیں معمولی خدمت ملی لیکن وہ اپنی لیاقت اور محنت سے برابر ترقی کرتے چلے گئے اور گورنمنٹ اور پبلک دونوں میں نام پایا۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا سے تھا ملازمت کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف اور تحریریں اسی زمانے کی ہیں۔ اب کام اتنے پھیل گئے تھے کہ ان کے لیے بہت فرصت درکار تھی۔ دوسرے سرکاری ملازمت کی وجہ سے بعض کاموں کی انجام دہی میں احتیاط برتنی پڑتی تھی۔ لہذا ۱۸۷۶ء میں پنشن پر خدمت سے سبکدوشی حاصل کرلی اور اس عظیم الشان قومی خدمت میں لگ گئے جس کی دُھن ان کے دل و دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔

شروع شروع میں جب مدرسۃ العلوم قائم ہوا اور لڑکے جماعتوں میں داخل

Marfat.com

ہوئے تو سید صاحب کا یہ معمول تھا کہ جب صبح کو کالج کی عمارت باغ وغیرہ کو جاتے تو بچوں کے کمروں میں بھی پہنچتے۔ ان سے باتیں کرتے، پڑھنے لکھنے کا حال دریافت فرماتے۔ مزاح بھی کرتے اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ وہ ان کے اکثر بزرگوں سے واقف تھے اور بہت شفقت فرماتے۔ لڑکے جب اُنھیں آتا دیکھتے تو سنبھل کے بیٹھ جاتے یا کوئی کتاب پڑھنے لگتے، کبھی کبھی وہ یونین کلب میں ڈی بیٹ (مباحثہ) کے روز بھی آتے اور کسی ایک پارٹی کی طرف سے تقریر کرتے۔ ایسا دن خوشی قسمتی سے شاذہی آتا تھا۔ جو طالب علم اچھی تقریر کرتے یا علمی و ادبی ذوق رکھتے اُن سے بہت خوش ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض سے وہ علمی کام بھی لیتے۔

سرسید نے مسلمانوں کو ذلت و تباہی کے بھنور سے نکالنے کا ایک ہی علاج سوچا تھا، یعنی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج۔ ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد اُسے عمل میں لانے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے۔ کیسی کیسی مخالفتیں اور صعوبتیں برداشت کیں، طعن تشنیع، لعنت ملامت سہی اور کیسی کچھ کھکھیڑیں نہ اُٹھائیں، لیکن نہایت استقلال اور عالی حوصلگی سے اپنے خیال پر جمے رہے اور جو سوچا تھا اُسے کر کے چھوڑا۔ مگر آخر آخر میں وہ اس کے نتائج سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ آخر بار جب وہ ۱۸۹۴ء میں پنجاب گئے اور اہل پنجاب نے بہ مقام جالندھر انھیں اڈریس دیا تو اس کے جواب میں اُنھوں نے صاف صاف کہا کہ "یونی ورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونی ورسٹی کے تابع ہیں اور اُس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جو ٹکڑا علم کا دیتی ہے اُسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اُسی وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونی ورسٹیوں کی غلام سے آزادی ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونی ورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔ یونی ورسٹی کی تعلیم ہمیں صرف خچر بناتی ہے۔ اے دوستو! میں خود بھی اُنھیں میں ہوں کیونکہ مجھے بھی ایک یونی ورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جب ہی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی"۔ یہ ایسی سچی بات ہے کہ جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ابتدا میں ان کا ارادہ

Marfat.com

یونی ورسٹی ہی قائم کرنے کا تھا لیکن حکومت وقت نے اُس کی تائید نہ کی۔ اُس زمانے میں یونی ورسٹی تو کیا ایک اچھا کالج بھی حکومت کی تائید بغیر چلانا محال تھا۔ ان کی وفات کے بعد وہ کالج جسے اُنھوں نے اپنے خون سے سینچا تھا یونی ورسٹی تو بن گیا مگر ان کا منشا پورا نہ ہوا۔ اب تو اس کی توقع خیال خام سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس کالج نے جو نئی بیداری اور قومی جذبہ پیدا کیا اُسے ہم فراموش نہیں کر سکتے۔

انسان کی اصلی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زاول میں ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و وقعت ہے۔ سرسید کی کامیابی کا راز اُن کے اخلاق حمیدہ میں تھا۔ اخلاق سے صرف یہی مُراد نہیں ہے کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کردے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جیسا کہ اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے "مرنج و مرنجان" ہو۔ اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت)، کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلا ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کے دُکھ درد کو اپنا درد دُکھ سمجھے۔ انتہا یہ کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے:

می تواں قطبِ زماں شد می تواں شد غوثِ وقت
ہرچہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن

چیست انسانی؟ تپیدن از تپِ ہمسائیگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پرّاں شدن

خوار دیدن خویش از خواریِ ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنتِ زنداں شدن

اخلاق کچھ تو انسان کو فطرتی طور پر ارثاً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں۔ لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم تعلیم نہیں رہی۔ ہماری تعلیم گاہیں دکانیں ہیں جن میں دساوری مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے یا

Marfat.com

ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمائشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے اور ذہن تک ہوتی ہے۔ اخلاق صرف و نحو و منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں رٹائے جاسکتے۔ رہا صالح ماحول اور صحبت تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت ہے کہ ان بزرگ اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے، پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اور دُکھ سہے اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے۔ اُن کی قربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔

سرسید کی ہستی بھی ایسی ہی تھی۔ ان کی زندگی سے ہمیں بہت سے بے بہا سبق مل سکتے ہیں ان کا اپنے نصب العین پر آخر دم تک جمے رہنا، اس کے لیے ہر جائز ذریعہ کو کام میں لانا، مخالف قوتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا، محنت و مشقت سے کبھی جی نہ چرانا، دن رات کام میں لگے رہنا، تساہل اور کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دینا خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اُنھوں نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ جو دل میں تھا وہی اُن کی زبان اور قلم پر تھا۔ کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ اس سے ان کی ذات یا اُن کے مقصد کو نقصان پہنچے گا۔ اُن کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے جب اُن کے خیر اندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دنیاوی اعتبار سے معاملے کی اونچ نیچ سمجھائی لیکن اُنھوں نے وہی کیا جو اُن کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرأت سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔

سرسید بڑے فیاض اور سیر چشم تھے۔ غریبوں اور مستحقوں اور مفلوک الحال شرفا کی ہمیشہ مدد کی۔ اکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ دہنے ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ نیکی اور ثواب کے کاموں میں مسجدوں کی تعمیر میں بھی اُنھوں نے بڑی فراخ دلی سے روپیہ صرف کیا۔ غدر کے بعد خانماں برباد پریشان حال مسلمانوں کی طرح طرح سے دستگیری کی۔ خصوصاً ان بے گناہ مسلمانوں کے لیے جن پر بغاوت کے الزام لگا کر سخت سزائیں تجویز کی گئی تھیں، بہت جدوجہد کی، تحقیقاتیں کرائیں، ثبوت بہم پہنچائے اور الزام سے بری کرایا۔ ان فیاضیوں کی

Marfat.com

بدولت آمدنی سے ان کا خرچ زیادہ رہا اور تنگ دست رہے۔ لیکن جب کالج کی دُھن ان کے سر پر سوار ہوئی تو شخصی فیاضی اور بذل و سخا سے ایک دم ہاتھ اُٹھالیا۔ اب جو کچھ تھا کالج کے لیے۔ اپنا تو خیر جو کچھ تھا وہ سب کالج کو پُوج دیا، مگر مشکل یہ تھی کہ دوسروں کی جیبوں پر بھی اُن کی بڑی کڑی نظر تھی۔ چندہ لینے کے کیسے کیسے نئے ڈھنگ نکالے تھے۔ کسی موقع پر چوکتے ہی نہ تھے۔ علی گڑھ کی نمائش میں کتابوں کی دکان لگائی اور خود دکان پر بیٹھ کر کتابیں بیچیں۔ کسی کے بیٹا پوتا پیدا ہوا یہ چراغی مانگنے کے لیے موجود۔ کہیں سیادت کے دعوے سے امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے جا پہنچے۔ کسی نے دعوت کی تو دعوت کے بدلے رُپیہ وصول کرلیا۔ نیشنل والنٹیر بن کر گلے میں جھولی ڈالی اور انتہا یہ ہے کہ ڈراما کر کے اسٹیج پر آئے اور غزلیں گائیں۔ کبھی اس کا خیال نہ کیا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اس چندے سے دوست آشناؤں کی جان عذاب میں تھی۔ خدا ان کی مغفرت کرے وہ یہ بدعت اپنے پیچھے ایسی چھوڑ گئے ہیں کہ آج تک اس سے نجات نہیں ملی۔ بلکہ حضرت چندہ کا زور روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے اور اب تو عالمگیر ہوگیا ہے۔ اگر سرسید کے چندہ لینے کے طریقوں اور ترکیبوں کی تفصیل لکھی جائے تو اچھی خاصی کتاب بن جائے۔

وہ کم آمیز اور دیر آشنا تھے۔ لیکن جس سے جو تعلق ہوگیا اُسے آخر دم تک نبھایا اور دوستوں کے تو وہ عاشق تھے۔ مولوی سید مہدی علی (نواب محسن الملک) اور سید زین العابدین کو جو خط لکھے ہیں انھیں دیکھیے۔ ایک ایک لفظ سے خلوص و صداقت ٹپکتی ہے۔ ایسے خط آپ کو شاید ہی کہیں اور ملیں، یہ اُن کے دلی جذبات کا آئینہ ہیں۔ یہی حالت کم و بیش دوسرے احباب کے ساتھ تھی۔ وہ اُن کے سچے ہمدرد اور اُن کی بہبودی اور سلامتی کے خواہاں رہتے تھے اور جب کبھی ان کے کسی دوست کا انتقال ہوجاتا تو انھیں سخت صدمہ ہوتا اور کئی کئی دن سوگ مناتے تھے۔ وہ دوستی کے مقابلے میں رشتے ناتے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے اُن کا قول تھا کہ "اگر ساری دنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اور اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے"۔ لیکن اُن کی دوستی آسان نہ تھی۔ وہ قدامت پرست، نہ تھے بلکہ اُنھوں نے بہت سی پرانی رسموں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ ہر بات کو تحقیق اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے، جو اس میں پوری اُترتی اُس پر عمل کرتے، تقلید کے

Marfat.com

مطلق قائل نہ تھے جدت اور نئی روشنی کے حامی تھے۔ خود وہ کئی ایسی بدعتوں اور جدتوں کے بانی ہوئے کہ مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر طرف سے مخالفتیں ہوئیں، مطعون ہوئے، مردود ہوئے، مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی، اپنی بات پر اڑے رہے، طوفان آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ لیکن ایک دوستی کے معاملے میں قدامت پرست تھے۔ چندے کی زد ہمیشہ دوستوں ہی پر پڑتی تھی۔ نئے نئے فنڈ قائم کرتے تھے اور سب سے پہلے فہرست میں دوستوں کے نام لکھتے اور خود ہی رقم تجویز کر کے ہر ایک کے نام کے سامنے لکھ دیتے۔ طوعاً کرہاً دینی ہی پڑتی۔ چندوں سے ان کا ناک میں دم تھا۔ بعض بے تکلف دوست بہت جھنجھلاتے اور بگڑتے مگر سید صاحب کبھی بُرا نہ مانتے۔ اُن کی باتوں میں کچھ ایسا جادو تھا کہ لوگ فوراً پسیج جاتے اور جو مانگتے نذر کر دیتے۔ یہ تو خیر ہوتا ہی رہتا تھا لیکن وہ دوستوں سے اس بات کی بھی توقع رکھتے تھے کہ قومی ہمدردی کے متعلق اُن کے سب کاموں اور سب تجویزوں میں ان سے اتفاق کریں۔ وہ عمر بھر مخالفتیں برداشت کرتے رہے اور یہ ان کے لیے معمولی بات ہو گئی تھی لیکن دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دوستی پُرانے وقتوں کی دوستی تھی۔ پُرانے بزرگ اسی پر عامل تھے دوست کچھ بھی کہے یا کچھ بھی کرے وہ ادبدا کے اس کا ساتھ دیتے اور مدد کرنے، لڑنے، مرنے، جان دینے کو تیار ہو جاتے۔ اُنھیں اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ یہ فعل بُرا ہے یا بھلا۔ اُن کا مقولہ تھا "یار کی یاری سے کام اس کے فعلوں سے کیا کام"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کو دوست بھی ایسے ملے تھے کہ ان پر جان چھڑکتے تھے اور یہ ان کی بڑی خوش نصیبی تھی۔ یہ سب سید کے خلوص، سچائی، راست بازی اور محبت کا اثر تھا۔

وہ اپنے دفتر کے ملازموں پر نیز نچ کے نوکروں سے بڑی شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آتے تھے اور ان کے عیوب سے چشم پوشی کرتے تھے۔ جو ایک بار اُن سے بندھ گیا پھر وہ گویا اس کی جاگیر تھی۔ مرتے دم تک ساتھ رہا۔ یوں بھی وہ کسی کی شکایت نہیں سنتے تھے لیکن اگر کسی نے اُن کے ملازم کی بددیانتی، بداطواری وغیرہ کی شکایت کی تو وہ سنی ان سنی کر دیتے تھے اور ان کے اعتماد میں ذرا فرق نہ آتا۔ وہ کسی ملازم کو شکایتیں سننے کے بعد بھی برطرف نہ کرتے یہ بات ان میں پُرانی تہذیب کی تھی۔ میں نے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جب انھوں نے کسی پر اعتماد کر لیا تو پھر کوئی کچھ کہا کرے اور کیسی ہی شکایت کرے

Marfat.com

اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اُلٹے خفا ہوتے تھے۔ اسی قسم کی مروت سرسید میں بھی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے "خانۂ مروت تباہ"۔ چنانچہ ان کے دفتر کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال کے معاملے میں یہی ہوا۔ یہ شخص علی گڑھ کے ممتاز کایستھ خاندان کا تھا۔ اس کا باپ پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا۔ بارہا ان تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابل اعتماد نہیں ہے۔ اتنی کم تنخواہ میں وہ جوڑی پر آتا ہے اور بڑی شان سے رہتا ہے۔ اس کی دیانت مشتبہ ہے۔ میں نے بھی اُس شخص کو دیکھا تھا وہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے کہ شریف زادہ ہے، گھر سے خوش حال ہے وہ صاف ستھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اس سے جلتے ہیں۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ پنجاب میں وہ سرکاری ملازم تھا اور روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزا پاچکا ہے۔ اُس پر انھوں نے فرمایا کہ شریف ایک بار ٹھوکر کھا کر پھر سنبھل جاتا ہے اور خطا نہیں کرتا۔ اس اعتماد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جعلی دستخط بنا بنا کر چیک جاری کرتا رہا اور ایک لاکھ سے کچھ اوپر روپیہ خورد برد کرلیا۔ اس غبن کا حال اس کے دفعتہً بیمار ہونے پر کھلا۔ اُس سے سید صاحب کو جو صدمہ پہنچا وہ بیان سے باہر ہے۔ عدالت کی حاضری کی جو چخ لگی تو اس سے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ شام بہاری لال پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور اسی بیماری کی حالت میں گرفتار ہوا اور حوالات میں رکھا گیا۔ اثنائے مقدمہ ہی میں جبکہ وہ حوالات میں تھا کچھ کھا کر مر گیا۔ اس حادثے سے سرسید کو تو سخت اذیت اور رنج و ملال پہنچا ہی تھا، کالج کے کاموں پر بھی کچھ دن کے لیے برا اثر پڑا۔

نج کے ملازموں سے بھی ان کی مروت کا یہی حال تھا۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازموں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جائے۔ نوکروں کی مار پیٹ یا بدزبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بداخلاقی سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ایک طالب علم (بورڈ) نے کالج کے ایک ملازم کو کسی بات پر مارا تو سید صاحب بہت برافروختہ ہوئے اور انھوں نے حکم دیا کہ اُسے خارج کردیا جائے۔ اس پر طالب علموں نے بڑا ہنگامہ مچایا اور ان کی ایک بڑی جماعت کالج چھوڑ کر شہر چلی گئی۔ شہر کے ذی اثر اور ہمدرد رئیسوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، لیکن سرسید کا اصرار تھا کہ جب تک طالب علم ملازم سے معافی نہ مانگے گا اُسے کالج میں داخل نہ کیا جائے گا۔ یہ سبق اُنھیں والدہ نے دیا تھا۔ لڑکپن میں انھوں نے گھر کے پُرانے ملازم کو کسی بات پر تھپڑ مارا۔ ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو

Marfat.com

بہت ناراض ہوئیں اور کہا اسے گھر سے نکال دو، یہ اس گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ تین دن تک خالہ کے مکان میں چھپے رہے۔ تیسرے دن خالہ والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں۔ اُنھوں نے کہا جب تک وہ نوکر سے قصور معاف نہ کرائے گا میں معاف نہیں کروں گی۔ چنانچہ جب نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تو قصور معاف ہوا۔ یہی ایک نہیں انھوں نے اخلاق کے بہت سے سبق اپنی والدہ سے سیکھے اور عمر بھر اُن پر عمل کیا۔

وہ بڑے خوددار تھے اور کسی ایسی بات کو جو خودداری کے خلاف ہوتی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ ابتدا میں جب وہ مدرستہ العلوم قائم کرنے کا ڈول ڈال رہے تھے، "انڈین آبزرور" میں اس کے خلاف ایک آرٹیکل چھپا جس میں یہ لکھا تھا کہ مسلمان سخت متکبر اور متعصب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔ اس کے جواب میں سرسید نے بڑا سخت آرٹیکل لکھا اور لکھا "کہ ہاں ہم متکبر بھی ہیں اور متعصب بھی، پر کیوں نہ ہم ایسا طریقۂ تعلیم اختیار کریں جس سے ہمارے تکبر اور تعصب میں بھی خلل نہ آئے اور ہم تعلیم بھی پائیں"۔

وہ اپنے طالب علموں سے بھی ایسی ہی خودداری کی توقع رکھتے تھے۔ ایک سال (غالباً ۱۸۹۲ء میں) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں تھا۔ اجلاس ختم ہوگیا تھا، سب چلے گئے تھے اور ہال خالی تھا۔ صرف سید صاحب رہ گئے تھے جو میز پر سے اپنے کاغذ سمیٹ رہے تھے۔ اس اثنا میں طالب علم چپکے چپکے آئے اور کرسیوں پر بیٹھتے جاتے تھے۔ سید صاحب نے جو یہ دیکھا تو پوچھا کیا ہے، کیوں جمع ہو رہے ہو؟ ایک طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا کہ کانفرنس میں بمبئی کے ایک سیٹھ صاحب آئے ہیں وہ طالب علموں کو مٹھائی تقسیم کریں گے۔ یہ سننا تھا کہ برس پڑے اور کہا تم بڑے بے غیرت ہو کہ مٹھائی کے لالچ میں یہاں بھکاریوں کی طرح آبیٹھے ہو۔ تمھیں شرم نہیں آتی، کیا کالج سے تم نے یہی بے غیرتی سیکھی ہے ... اب لڑکے کھسکنے شروع ہوئے اور چند منٹ میں ہال خالی ہوگیا اور سید صاحب اپنے کاغذ سمیٹ کر رخصت ہوگئے۔ اُن کی بڑی تمنا تھی کہ مدرستہ العلوم کے طلبہ ہمت، جرات اور شریفانہ اخلاق سے متصف ہوں اور جب کبھی کسی طالب علم سے اخلاقی جرأت یا خودداری کا فعل صادر ہوتا تو بہت خوش ہوتے۔

Marfat.com

ایسی ہی خودداری کا ایک دوسرا واقعہ لکھتا ہوں، ان کے ایک عزیز دوست (غالباً مولوی مشتاق حسین) نے جب کہ وہ یو۔ پی میں کسی سر رشتے میں ملازم تھے یہ اطلاع دی کہ ان کا افسر نماز پڑھنے پر معترض ہوتا ہے۔ سید صاحب نے اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بھائی... کل میں سارے دن متردد رہا، کیونکہ تمہارا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ آج خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ گو میں کسی وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ یہ باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامت اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم نے اس معاملے میں جو پیش آیا، نہایت لچر پنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے اُس کو اپنی شامت اعمال سے، جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو اس کا صبر ایک لمحہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے، جس کے بخشے جانے کی توقع ہے اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے ہی خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جو کبھی اس قسم کی بحث نہ آتی اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا اور "حضور رخصت ہی دیں، تنخواہ کاٹ لیں" کہنا واہیات تھا، تڑاق سے استعفا دے دینا تھا۔ صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان، قادرِ مطلق کے حکم کی اطاعت کروں گا، نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی، فاقے کرتے مر جاتے نہایت اچھا ہوتا۔ والسلام"۔

"سیرت فریدیہ" میں سرسید نے جو حالات لکھے ہیں ان کے پڑھنے سے ظاہر ہے کہ گھر کے سارے انتظام اور اولاد کی تربیت کا بار اُن کی والدہ پر تھا۔ یہ سرسید کی خوش

Marfat.com

نصیبی تھی کہ ان کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور ان میں انسانی اخلاق کی بہت سی خوبیاں تھیں۔ سرسید کی زندگی پر ان کا بڑا اثر تھا۔ عام توہمات جو مسلمانوں میں مذہب کے نام سے مروج ہوگئے ہیں ان کے گھر میں ان باتوں کا مطلق چرچا نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس زمانے میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہوسکے نہیں پاتا"۔ غرض کہ مذہبی پابندی ابتدا سے اُن کی تعلیم و تربیت کا جز تھی۔ لیکن جب انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور خصوصاً مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اُٹھایا تو انھیں مذہبی مسائل اور مذہبی تحقیق کی طرف خاص طور سے توجہ کرنی پڑی، کیونکہ اُن کی اس تحریک کے خلاف سارے ملک میں مخالفتوں کا جو زبردست طوفان اُٹھا اور اعتراضات کی جو بوچھاڑ ہر طرف سے ہوئی وہ سب مذہب کی بنا پر تھی۔ علاوہ اس کے عیسائی مشنریوں اور یورپی مصنفوں کی طرف سے اسلام کی حقانیت اور بانیِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت پر پے در پے حملے ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت کے ارکان نے اسلام کو فساد و بغاوت کا بانی مبانی قرار دے رکھا تھا اور یہ بات ان کے دل میں جاگزیں تھی کہ مسلمان ازروئے مذہب حکومت انگریزی سے بدخواہی اور بغاوت کرنے پر مجبور ہے۔ ان سب آفتوں سے بڑھ کر ایک آفت یہ تھی کہ قوم کے نوجوان جو کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں مغربی تعلیم پا رہے تھے ان کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا ہو رہے تھے اور وہ مذہب سے بیگانہ اور متنفر ہوتے جا رہے تھے۔ مولوی صاحبان، ان کی کتابیں اور مناظرے تشفی نہیں کرسکتے تھے۔ کیونکہ جدید سائنس نے پُرانے حربوں کو بے کار کردیا تھا۔ سید صاحب نے بڑی دلیری اور جرأت اور کمال تحقیق اور محنت سے ان تمام خطروں کا مقابلہ کیا اور اس مقابلے کے لیے انھیں ایک نیا علمِ کلام ایجاد کرنا پڑا۔ یہ ان کا ایسا عظیم الشان کام ہے کہ اس کے تفصیلی بیان کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصر یہ کہ اوہامِ باطلہ اور خیالاتِ فاسدہ جو مذہب کی آڑ لے کر اسلام اور اہلِ اسلام میں گھر کر چکے تھے، ان کا قلع قمع کیا۔ جن بااثر انگریزوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام غداری اور بغاوت سکھاتا ہے اور مسلمان کبھی حکومت کے وفادار نہیں ہوسکتے اور جن یورپین مصنفوں نے یہ لکھا تھا کہ اسلام ترقی کا مانع ہے ان کی تحریروں کے دنداں شکن جواب دیے۔ جس زمانے میں

حکومت نے وہابیوں پر ظلم توڑے اور اُن کے عقائد کو فساد اور بغاوت کا سرچشمہ قرار دیا تو بڑی دلیری سے اُن کی حمایت کی اور ان کے خلاف جو کچھ کہا گیا اور لکھا گیا اس کی پرزور تردید کی، یہاں تک کہ اس کا صاف اقرار کیا کہ میں خود وہابی ہوں۔ سر ولیم کی کتاب کے جواب لکھنے کی تیاری کی جس میں اسلام پر، رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر سخت اعتراض کیے تھے۔ ہندوستان میں کافی سامان میسر نہ آیا تو لندن کا سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں اور دوسرے ذرائع سے کتابیں مہیا کیں۔ اس کی تیاری اور طباعت میں مصارف اس قدر بڑھ گئے کہ اپنا کتب خانہ اور سامان وغیرہ فروخت کرنا پڑا، قرض لیا اور دوستوں سے روپیہ جمع کیا اور شب و روز محنت شاقہ اُٹھا کر ایسا مدلل جواب لکھا کہ مخالف بھی مان گئے۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے شکوک رفع کرنے کے لیے بے شمار مضامین لکھے اور قرآن کی تفسیر بھی اسی نیت سے لکھنی شروع کی۔ مخالفوں کی تحریروں کے جواب لکھے، تقلید کے خلاف زبردست مضامین تحریر کیے۔ ابطالِ غلامی پر ایک رسالہ لکھا اور یہ ثابت کیا کہ لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیثِ صحیح میں نہیں۔ سید احمد خاں پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام میں غلامی نہیں اور اسے ثابت کر کے دکھا دیا۔ تحقیق اور اجتہاد میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اُسے توڑا۔ بہت سے مسائل کی الجھنوں کو سلجھایا۔ غرض اسلام کی وہ بے نظیر خدمت کی جو کسی دوسرے سے نہ بن آئی۔

سر سید بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے اور جیسا کہ انھوں نے بارہا کہا ہے کہ میں اس لیے مسلمان نہیں ہوں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا بلکہ اسلام پر میرا یقین میری ذاتی تحقیق پر ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کو جن کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ انگلستان جا کر ترکِ اسلام نہ کر دیں، لکھتے ہیں، "جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دینِ اسلام کو حق سمجھتا ہوں اس قدر یقین آپ کے شہر کے بڑے بڑے لمبی ڈاڑھی والوں کو ہزار ہزار دانے کی تسبیح والوں کو اور جو مکہ مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشد کا جبہ و دستار لے کر آتے ہیں ان کو بھی نہیں۔" ایک دوسرے دوست کو اسی بارے میں تحریر کیا، "اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا۔" اسلام پر جہاں کسی نے کوئی نکتہ چینی کی وہ فوراً اس کا جواب لکھتے چنانچہ اس زمانے میں جبکہ

Marfat.com

ان کی حالت بہت نازک تھی ایک عیسائی نے امہات المومنین پر ایک رسالہ لکھا جس میں آنحضرت ﷺ کی ازواج اور آپ کے اخلاق پر بہت سخت اعتراض کیے گئے تھے۔ باوجود یہ کہ کثرتِ آلام کی وجہ سے ان پر بقولِ مولانا حالی، "ایسا سکتے کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقشِ دیوار بن گئے تھے۔" مگر اسی حالت میں اس رسالے کا جواب لکھنا شروع کیا۔ ابھی یہ تحریر پوری نہ ہونے پائی تھی کہ رحلت فرما گئے۔

اگرچہ وہ پکے مذہبی اور اسلام کے شیدائی تھے مگر تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ان کے احباب میں ہندو اور عیسائی بھی تھے اور اُن سے اُن کا برتاؤ ویسے ہی خلوص اور محبت کا تھا جیسا مسلمان دوستوں سے۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ لکھی جس سے دوسرے مذہب والوں کی دل آزاری ہو۔ اگرچہ بعض معاملات میں اُنھیں ہندو سرگروہوں سے اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کا اثر کبھی اُن کے اخلاق یا برتاؤ پر نہیں پڑا اور وہ ہمیشہ باہمی اتحاد اور آشتی کی تلقین کرتے رہے۔ یہ محض زبانی باتیں نہ تھیں بلکہ اس پر اُن کا عمل بھی تھا۔ یہ سب معلوم ہے کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے خلاف ناقابل برداشت دریدہ دہنی سے کام لیا ہے جس نے ہندو مسلمانوں میں سخت منافرت پھیلا دی تھی۔ لیکن جب سوامی جی کا انتقال ہوا تو سرسید نے اُن کی وفات پر بڑا آرٹیکل لکھا اور اُن کے اصلاحی کاموں کی بے حد تعریف کی جسے پڑھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یہ ہے ایک سچے اور پکے مسلمان کی بے تعصبی اور رواداری۔ یہ ایک نہیں ایسی اُن کی بیسیوں تحریریں ہیں۔

افسوس کہ ان کی زندگی کے آخری ایام انتہا درجے کی تلخی اور کرب و الم میں گزرے۔ پہلا صدمہ کالج کے روپے کے غبن کا ہوا اور دوسرے اُس سے بڑھ کر سید محمود کا۔ کثرت شراب نوشی نے سید محمود کا دماغ مختل کر دیا تھا اور وہ عالم دیوانگی میں ایسی حرکات کر بیٹھتے تھے جو کسی عنوان قابل برداشت نہیں ہو سکتی تھیں۔ سرسید کو ناچار وہ گھر چھوڑنا پڑا جہاں وہ تیس سال سے مسلسل رات دن کام کرتے رہے تھے اور ایک غیر گھر میں جا کر پناہ لینی پڑی۔ اس رنج نے جو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا سید صاحب کو بٹھا دیا، دل بجھ گیا، خوش دلی جاتی رہی۔ لیکن وہ لگن جو دل کو لگی ہوئی تھی اس کی آگ اس وقت بھی باقی تھی۔ موت سے چند روز پہلے تک جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو گئے، قومی معاملات پر برابر لکھتے رہے۔ آخر وہ دن آ پہنچا جو کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا اور وہ

Marfat.com

قوم کا فدائی ۱۸۹۸ء کو ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

وہ ہم میں نہیں رہا لیکن وہ اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گیا ہے جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اُس کی رائے اور اجتہاد میں کہیں کہیں غلطیاں بھی نظر آئیں گی لیکن اس کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مطلق شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ اس برعظیم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم و فضل، پاک نفس بزرگ اور مصلح گزرے ہیں۔ لیکن ان کا دائرہ عمل ایک یا دو مہمات تک محدود تھا۔ لیکن سرسید کا میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ ایسا جامع صفات اور جامع حیثیات، بے لوث و بے نفس، پُرعزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت اور ہمہ تن ایثار مصلح ہمیں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد نصیب ہوا۔ اس نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایسا قومی جذبہ قومی پیدا کیا جو اب تک کام کر رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ قومیت کا خیال بھی اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر اُس کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قصر پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیر مرد نے رکھی تھی۔ اُس کا دل قوم کی دردمندی سے لبریز تھا۔ عمر بھر اسی دُھن میں لگا رہا اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دُنیا سے چل بسا۔ اُس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔ جب مرا تو کفن کے لیے ایک پیسہ نہ نکلا۔ غیروں نے اپنے خرچ سے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ یہ ہے مقبول بندوں کی شان۔

زیستن در فکرِ قوم و مردن اندر بند قوم
گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

## حاشیہ

(۱) خطبہ صدارت شعبۂ اردو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۱ء

# سرسید احمد خاں مرحوم کی مجوزہ
# ورنیکلر یونی ورسٹی

سرسید مرحوم کو ابتدا سے اپنے ملک کے علمی اور تعلیمی مسائل سے گہرا لگاؤ تھا اور جہاں کہیں وہ رہے انھوں نے اشاعتِ تعلیم میں مقدور بھر کوشش کی اور خود بھی اپنی تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس سے ملک کو بہت فائدہ پہنچا اور خیالات میں مغربی تعلیم کی طرف سے بہت کچھ تغیر پیدا ہوا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اسی شوق اور انہماک کا نتیجہ تھا کہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم ہوا۔

اس کے علاوہ سنہ ۱۸۶۶ء میں ایک انجمن برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ "ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عمل داری میں بڑی دقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اُس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ آف ڈائرکٹرز تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان کی ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور اب ہندوستان کے اُمورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لیے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور معاملات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں، ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے، جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہش سے ان کو مطلع کر سکیں اور جس طرح اُن انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایسوسی ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے، اسی طرح ہم بھی تمام اضلاعِ شمال مغرب کی طرف سے ایک ایسوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعے سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں"۔

چنانچہ اس انجمن کے توسط سے بہت سی شکایتوں اور تکلیفوں کا تدارک ہوا۔ لیکن سب سے اہم اور قابل قدر تحریک ورنیکلر یونی ورسٹی کی تھی جو سرسید نے اس کی وساطت سے سنہ ۱۸۶۷ء میں گورنمنٹ میں بھیجی۔

اس درخواست یا تحریک کا لب لباب یہ تھا۔ اوّل یہ کہ اعلا درجے کی تعلیم عام کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس سے میں بڑے بڑے علوم اور فنون کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے ہوا کرے۔ دوم یہ کہ دیسی زبان میں انھیں مضمونوں کا امتحان سالانہ ہوا کرے جس میں کہ اب طالب علم کلکتہ کی یونی ورسٹی میں انگریزی زبان میں امتحان دیتے ہیں۔ سوم یہ کہ جو سندیں اب انگریزی زبان کے طالب علموں کو علم کی مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے کے عوض میں عطا ہوتی ہیں وہ ہی سندیں ان طالب علموں کو عطا ہوا کریں جو انھیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔ چہارم یہ کہ خواہ ایک اردو فریق کلکتہ کی یونی ورسٹی میں قائم کیا جائے یا ممالک شمالی و مغربی میں ایک یونی ورسٹی دیسی زبان کی علاحدہ قائم کی جائے۔

حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جبکہ انگریزی تعلیم کا آغاز تھا سرسید کو دیسی زبان کی یونی ورسٹی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس سے اُن کی روشن خیالی اور دوراندیشی کا پتا لگتا ہے۔ یہ وہ خیال ہے کہ برٹش انڈیا میں اب بھی لوگ اسے پیش کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔

ہم یہاں اُس عرض داشت کی جو نواب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل کی خدمت میں پیش کی گئی تھی، پوری نقل درج کیے دیتے ہیں اس کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ سرسید نے اپنی تحریک کی تائید میں کیسی مدلل اور معقول بحث کی ہے۔ یہ دلائل اب بھی ویسے ہی قوی اور لائق غور ہیں جیسے اُس وقت تھے۔

## مسودہ

عرض داشت
برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب
بحضور جناب نواب گورنر جنرل بہادر،
باجلاس کونسل

Marfat.com

ہم برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال و مغرب جن کے دستخط اس عرض داشت کے ذیل میں ثبت ہیں بہ دل و جاں گورنمنٹ کی ان سخت کوششوں سے بخوبی واقف اور اُن کی قدر و منزلت کرنے والے ہیں جو اس نے ہندوستانیوں کی عام تعلیم کے باب میں کی ہیں اور ان کی عوض میں ہم سب پر گورنمنٹ کی نہایت بڑی احسان مندی واجب اور لازم ہے۔ ہم کو اچھی طرح یقین ہے کہ گورنمنٹ نے اس تعلیم کے کام کو نہایت خالص نیت اور بالکل بے غرضی سے اختیار کیا ہے۔ تعلیم سے گورنمنٹ کا اصلی مقصود بالکل لوگوں کی بہبودی اور فلاح ہے۔ وہ اپنی رعایا کی حالت کو ترقی دینے کے باب میں ہمیشہ ساعی رہتی ہے۔

اس یقین کے مستقل اثر سے جو ہمارے دلوں پر اچھی طرح نقش پذیر ہو گیا ہے پیش گاہ حضور میں ایسی چند تدبیریں پیش کرنے کے لیے ہماری ڈھارس بندھی ہے، جس کا عمل در آمد ہو جانے پر ہم کو کامل بھروسہ ہے کہ اس موجودہ سررشتۂ تعلیم سے لوگوں کو حد سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا اور ہم کو بہت بڑی توقع ہے کہ گورنمنٹ کمالِ فیاضی سے ان تدبیروں پر از بس سنجیدہ اور پسندیدہ توجہ فرمائے گی۔

ہم اقرار کرتے ہیں کہ جو علوم و فنون اب ایشیا کے ملکوں میں جاری ہیں جن کے موضوع اور تاریخی حالات ہمارے بہت سے مشہور مصنفوں کی کتابوں میں موجود ہیں اور اپنی اصل حالت میں بغیر کسی طرح کے تغیر و تبدل اور ترقی کے ہم تک پہونچے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے اصول پر مبنی ہیں جو زمانۂ حال میں علم کی ترقی ہونے سے بالکل غلط اور ناجائز ٹھیرے ہیں اور بعضے علم ایسے ہیں کہ اگرچہ بنیاد اُن کی صحیح اور مضبوط اصول پر ہے مگر زمانۂ حال کی نئی نئی تحقیقاتوں اور تلاشوں کے سبب ان کا رنگ

ڈھنگ بالکل بدل گیا ہے اور بعضے علم ایسے ہیں کہ اب تحصیل
ان کی محض فضول اور غیر مروّج ہو گئی ہے اور برخلاف اس کے
آج کل دنیا میں بہت سے ایسے علوم وفنون کی گرم بازاری ہے
جو زمانۂ حال کے ایجاد ہیں اور ان کا حال ہمارے بزرگوں کو بالکل
معلوم نہ تھا۔ پس یہ ایک ایسی بات ہے جس سے کوئی شخص
انکار نہیں کرسکتا کہ ایشیا میں جو علوم اور زبانیں اب جاری ہیں
اُن کی تحصیل ہمارے علم کی ترقی اور روشن ضمیری کے واسطے
محض غیر کافی ہے اور یہ بات بھی ایسی ہی تحقیق اور مسلّم ہے کہ
مذکورہ فائدہ کے حاصل کرنے کے واسطے کوئی ذریعہ اس سے
بہتر نہیں ہے کہ ہم انگریزی زبان کو سیکھیں اور اب جو مالامال
خزانے علم و ہنر کے زمانۂ حال میں جمع اور قائم ہوئے ہیں ہم
سب اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کی جو تدبیر اس
ملک میں انگریزی زبان کے رواج دینے کی ہے وہ حقیقت میں
نہایت عمدہ اور مناسب سوجی گئی ہے۔

مگر یہ بات ممکن ہے کہ جس حالت میں ہم ایک اچھے کام
کرنے پر کوشش کرتے ہوں تو ہم اور ایسے کاموں سے جو زیادہ
ضروری اور زیادہ مرتبے کے ہیں غافل رہویں اور اسی طرح سے
ان کوششوں کی قدر و منزلت کو گھٹا دیویں جن کو اگر مناسب اور
بلا رو رعایت کے کیا جائے تو ہم کو وہ نہایت اعلا درجے کی
کامیابی پر پہنچاویں۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ یہ غلطی تعلیم کے
سر رشتۂ حال میں ہوئی ہے۔ ہماری بڑی آرزو یہ ہے کہ یہ سر
رشتہ ایسا بے عیب اور بے داغ ہو جائے جیسا کہ حوصلہ توقع میں
سما سکتا ہے اور ہم اس بات کا خیال کرنے سے باز نہیں رہ سکتے
کہ ہم ایک اچھے کام کے پورا کرنے پر کمر باندھے رہنے سے
ایسے مطلبوں سے غفلت کر رہے ہیں، جو بہت بڑی قدر و
منزلت رکھتے ہیں اور ضروری ہیں۔

Marfat.com

جو گورنمنٹ خصوصاً انگریزی گورنمنٹ اپنی رعایا کے بہت سے گروہوں کو عام تعلیم دینے کا کام اختیار کرے تو اُس کا فرض ایسے علم اور پند و اور نصیحت کی تعلیم دینا ہے جو لوگوں کے روزمرہ کے کاروبار میں کام آوے اور فائدہ بخشے اور اس سے ان کی عادت اور اخلاق کی تہذیب اور اصلاح ہووے اور لوگوں کو قدرت اور علم کے حقائق اور حالات سے جہاں تک ممکن ہو آگاہی حاصل ہو اور ان کے دلوں میں عمدہ عمدہ اصول اور بڑے بڑے اعلا درجے کے خیال پیدا ہوویں۔ مگر اس بات کی احتیاط رہے کہ ان اصولوں اور خیالوں کی اصل و بنیاد کسی مذہب کے مسائل یا کسی قومی مذہبی رسم و رواج پر نہ ہووے بلکہ وہ قدرتی اخلاق کے قوانین اور علی العموم عقل کے تسلیم کر لینے پر مبنی ہو۔ یہ کام مشکل تو بے شک ہے مگر غیر ممکن نہیں اور اگر اُس کو کامیابی کے ساتھ انجام دینے پر کوشش کی جائے تو نتیجے اُس کے ملک کے حق میں نہایت عمدہ ہوں۔ چنانچہ لوگوں کی عقل کے روشن ہونے سے ان کی مال و دولت اور جسمانی فائدوں کو ترقی ہوگی جبکہ وہ اُن سب چیزوں کی ماہیت سے جو ان کے چاروں طرف نظر آتی ہیں واقف ہوجائیں گے اور ایسے فاسد خیالوں اور بیہودہ خوف و اندیشوں کو آئندہ فوراً اور یک بیک قبول نہ کر لیا کریں گے جس سے لوگوں کی طبیعتوں کو پریشانی حاصل ہوتی اور سب میں ایک ہل چل پڑجاتی ہے اور عام امن و آسائش اور انتظام میں خلل واقع ہوتا ہے، علاوہ اس کے جو نفرت اور عداوت نسل اور مذہب کی غیریت سے پائی جاتی ہے وہ قدرت اور عقل کی روشنی کے آگے نیست و نابود ہوجائے گی اور بجائے ان سب کے آپس میں لحاظ و پاس اور بھروسہ قائم ہوجائے گا۔

جو گورنمنٹ سوائے ان غرضوں کے اور کسی قسم کی اور شاید اس کمتر خواہش کے سبب سے اپنی رعایا کی تعلیم پر آمادہ

Marfat.com

ہو کہ ان کو صرف اس قدر تعلیم کیا جائے کہ وہ اپنی زندگی کے معمولی کاروبار کے انجام دینے کے لائق ہوجائیں تو وہ گورنمنٹ رعایا کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرے گی جو ایک آدمی اپنا بوجھ کھنچوانے یا اور کوئی کام لینے کی غرض سے کسی جانور کے ساتھ اس کے سدھانے میں کرتا ہے مگر ہم کو دل سے یقین ہے کہ گورنمنٹ ہند کی یہ غرض اور ایسا ارادہ نہیں ہے بلکہ اس بات کو ہم تحقیق جانتے ہیں کہ اس نے جو کام تعلیم کا اختیار کیا ہے وہ بڑے بڑے اعلا درجے کے مقصدوں اور ارادوں سے شروع کیا ہے چنانچہ اس کا مشہور عمدہ ثبوت وہ تین یونی ورسٹیاں یعنی مدرسہ ہائے اعظم ہیں جن میں علی العموم علم تک ہر ادنیٰ و اعلا کی دسترس ممکن ہے۔ اس لیے ہم اپنی گورنمنٹ کو اس بات کے تصفیہ پر متوجہ کراتے ہیں کہ جو سرشتہ تعلیم کا آج کل سرکار کا درست اور قائم کیا ہوا موجود ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اُس سے تعلیم کے اصلی مقصد جن کا تذکرہ بالاجمال اُوپر ہوا حاصل ہوویں۔ ہم نیازمندی سے عاجزانہ عرض کرتے ہیں کہ ہماری رائے میں اس سرشتہ سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوں گے۔ سرشتہ مذکور کے ذریعے سے چودہ کروڑ آدمیوں میں جو گورنمنٹ ہند کے محکوم اور مطیع ہیں چند آدمیوں کو ایک عمدہ اور معقول تعلیم کے تمام حظ اور لطف اور فائدے حاصل ہوئے ہوں مگر جب کہ بہت سی خلقت کا ان چند تعلیم یافتہ سے مقابلہ کیا جائے تو ان کی تعداد نہایت بے حقیقت اور خفیف ٹھہرتی ہے کیونکہ خلقت کے اس انبوہ کثیر کو روشن ضمیری حاصل ہونا تو ایک طرف روشن ضمیری کا پرتو بھی اس پر نہیں پڑا ہے۔ غرض کہ ملک باعتبار ہئیت مجموعی اپنی اصل تاریکی کی حالت میں ہے اور اس نے علم اور شائستگی کے کسی فائدہ کا مزہ نہیں چکھا۔ ہم عرض کرچکے ہیں کہ

Marfat.com

اس عرض داشت کے پیش کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ ایشیا کے مردہ علوم و فنون، شائستگی اور خوبی کو تروتازہ کیا جائے بلکہ اصل غرض یہ ہے کہ پچھلے زمانوں میں اہلِ یورپ نے جو علم و ہنر بہم پہنچایا ہے اور وہ زیادہ عمدہ اور مفید ہے اس کا رواج ملک میں ہووے۔ سوا اس کے ہماری خواہش یہ ہے کہ بجائے چند آدمیوں کے گروہوں کے گروہوں کو فائدہ پہنچے، اخلاقِ پسندیدہ اور قومی دانائی کی نعمتیں تمام ملک پر پھیل جائیں۔

بالفعل بڑے بڑے علموں سے صرف زبان انگریزی کے ذریعے سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے اور یہی بات ایسی ہے جس کے سبب سے ملک میں مفید علموں کے عموماً جلد شائع ہونے میں بڑے بڑے موانع اور ہرج واقع ہوتے ہیں اور اسی کے باعث سے لوگوں کی رائے اور خیالات میں بہتر تبدیلی ہونے میں توقف ہوتا ہے اور عام تعلیم مضمحل اور پژمردہ ہو گئی ہے اور چند لوگ ایسے ذریعے سے جس تک رسائی مشکل ہے اس علم کے ثمروں کو حاصل کر سکتے ہیں جس تک سب کی رسائی آسان اور سہل ہونی چاہیے۔

جو حال تعلیم کا ہو رہا ہے اس کا باعث یہ نہیں ہے کہ لوگ انگریزی کی تحصیل سے گریز یا نفرت کرتے ہیں۔ جن وقتوں میں لوگ انگریزی کی تحصیل سے گریز یا نفرت کرتے تھے ہم کو یقین ہے کہ وہ زمانہ ایسا گزر گیا کہ پھر کبھی نہ آئے گا، انگریزی کی ضرورت اور اس کے فائدوں کو لوگوں نے اچھی طرح سمجھا اور دیکھا اور علانیہ اقرار کیا ہے اور ان میں سے اکثر نے اپنی رایوں کو اپنے ہم وطنوں کی بڑی بڑی شاندار مجلسوں میں اس امر کی نسبت ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ ہم خاص ایک شخص یعنی سر سید احمد خاں صدر الصدور علی گڑھ کے قول نقل کرتے ہیں "خاص

Marfat.com

کر میں تمہاری توجہ اس بڑی ضرورت پر مائل کرنا چاہتا ہوں جو انگریزی کی تحصیل کرنے سے اہلِ ہند کو ہے اِس کی تحصیل اُن بڑے فائدے بخشنے والے عہدوں کے باعث سے ضروری نہیں جو اِس کے سبب سے حاصل ہوتے ہیں بلکہ ان بے نہایت فائدوں کے سبب سے ضروری ہے جو زندگی کے روزمرہ کے ذرا ذرا سے کاروبار میں بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی کا پورا علم ہم کو اس بات کے قابل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کے قوانین کو بخوبی سمجھ سکیں جو گورنمنٹ کے ایکٹوں اور معمولی روئیدادوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور تجارت کامیابی کے ساتھ کر سکیں اور اہلِ یورپ کے ساتھ ربط و ضبط بڑھا سکیں اور بہت سے علوم و فنون میں جن کی بحث بہت قابلیت سے انگریزی زبان میں ہے کامل ہو سکیں۔

تعلیم جواب ترقی کرنے سے تھکی ہوئی ہے اس کی اس حالت کے اور بھی کئی باعث ہیں جن میں سے سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ صرف انگریزی کی تحصیل کے ذریعے سے جیسے کہ اب مروج ہے علی العموم ہر ایک طالب علم باستثنائے بعض طالب علموں کے علم کے اس قدر درجہ یا اخلاق اور تربیت کے اس قدر مرتبے کو نہیں پہنچتا یا اس کی ذات سے ظاہر نہیں ہوتا جس کی لوگ تعظیم اور تکریم، حرص و تقلید کریں یا جس سے ان کے والدین کو یہ معلوم ہووے کہ انھوں نے نہایت اعلا درجے کی تعلیم پائی ہے البتہ سیکڑوں میں سے ایک کا اُس درجے کی عظمت تک پہنچنا ممکن ہے جس کی بڑی خواہش کی جاتی ہے مگر ایسے طالب علموں کی تعداد بہت خفیف اور تھوڑی ہے، اور ہزاروں جاہلوں پر جو ان کے گرد و پیش موجود ہیں کچھ اثر ان کا نہیں ہوتا۔ اس نقصان کے علاج کی غرض سے ہم اپنی تجویزیں پیش کرنے کے آرزومند ہیں۔ ہماری خواہشیں یہ ہیں کہ جو

Marfat.com

کوششیں انگریزی زبان کی اشاعت کے لیے بالفعل کی جاتی ہیں
وہ جاری رہیں بلکہ اُن کو وقتاً فوقتاً ترقی ہوتی رہے۔ مگر ایک اور
طریقہ تعلیم کا جو عام تعلیم کی ترقی کے لیے زیادہ موثر تصور کیا
جاتا ہے قائم اور جاری کیا جائے اور اس کے ذریعے سے انگریزی
زبان کو بجائے بہت تھوڑے آدمیوں کے بہت سے لوگوں کو
فائدہ پہنچانے کا وسیلہ بنایا جائے۔ جو طریقہ ہم تجویز کرتے ہیں
وہ تعلیم کے طریقہ مروجہ سے گو علاحدہ اور غیر ہو مگر اس سے
مخالف نہیں ہے۔ نتیجہ دونوں کا انجام کار ایک ہی حاصل ہوگا۔
وہ طریقہ یہ ہے کہ بجائے اس بات کے کہ صرف انگریزی ہی
زبان میں تعلیم کی جائے دیسی زبان کو بھی تعلیم کے اعلا درجے
کے مضمون اور مطالب میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ
گردانا جائے۔

بادی النظر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تجویز کا ایک مدت ہوئی
تصفیہ ہوچکا مگر ہم اس کے سخت مخالف ہیں کیونکہ ہم جو کچھ
تجویز کرتے ہیں اس پر کبھی مباحثہ تک بھی نہیں ہوا ہے۔ جس
بات کا تصفیہ ہوچکا وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان کا رواج اس ملک
میں ہونا چاہیے یا مشرقی زبانوں کا، اور مشرقی زبانوں میں جو
فضول علم و ہنر مندرج ہیں ان کی تحصیل کو ترقی اور رواج دیا
جائے یا نہیں۔ جو تصفیہ اس امر کا ہوا اس سے ہم کو بخوبی اتفاق
ہے وہ تصفیہ ہر طرح سے مقبول اور پسندیدہ ہے مگر جس تجویز کو
ہم گورنمنٹ اور لوگوں کی غور و فکر اور تصفیہ کرنے کے واسطے
پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس حالت میں ہم انگریزی کی
تعلیم قائم رکھیں اور اس کی ترقی میں کوشش کریں تو کیا ہم کسی
دیسی زبان کو اس قسم کا ذریعہ اختیار اور تجویز نہیں کرسکتے جو
ایک غیر ملک کی زبان کی نسبت علم کے عموماً شائع ہونے اور
لوگوں کے خیالات اور طور و طریقے اور اخلاق کی ترمیم کے واسطے

زیادہ تر مناسب ہو۔ کیا اہل یورپ کی روشن ضمیری اور شائستگی اور فضل و کمال کی تعلیم ایسی زبان کے ذریعے سے جس سے وہ ناآشنا ہیں اور وہ ایک غیر ملک کی ایسی زبان ہے جس کی تحصیل ممکن نہیں کہ ہندوستان مقبوضۂ سرکار کے چودہ کروڑ باشندے کرلیویں بہتر اور علاحدہ نہیں ہو سکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں کہ ان کروڑوں آدمیوں کو ایک ہی زبان اور وہ بھی نئی سکھائی جاسکے۔ یہ کب ہوسکتا ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی اس قدرت کے برخلاف عمل کرسکیں جو بابل کے مفاد پر اُس نے دکھائی۔ پس اگر یہ بات ممکن نہیں تو بجز اس کے اور کوئی علاج اور تدبیر نہیں کہ اہلِ یورپ کی روشن ضمیری اور ان کا علم اور فضل لوگوں کے علی العموم سکھانے کے لیے دیسی زبان کو ذریعہ ٹھہرایا جائے۔ جو معقول رائیں کہ ہاگسن صاحب نے ہندوستان میں علم پھیلانے کے لیے ایک جلسہ کی بنیاد پڑنے پر ظاہر کیں ان کا ذہن نشین کرنا نہایت مناسب اور بہت اچھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا ہے کہ میرے نزدیک اگر ہم کتابی ترتیب کے ذریعے سے ہندوستان کو فی الحقیقت فائدہ پہنچانا چاہیں تو وہ ہم کو اسی طرح پر پہنچانا چاہیے جس طرح کہ ہم اس کو اپنی حکومت اور اپنے قوانین سے پہنچاتے ہیں یعنی کتاب کے علم کو جھگڑوں اور دقتوں سے پاک صاف اور عام فہم کرکے ان کی خاص زبان سے اس کو ہم رشتہ اور ہم پیوند کردیں تاکہ بہت لوگوں کی رسائی اس تک ہونے لگے اور انہی مقصدوں کو اصلی اور مستحکم سمجھ کر ان کی تہذیب اور تربیت کو اپنا بڑا منشا قرار دیدیں۔ علم کی اس طرح پر تعلیم کی جائے کہ وہ روزمرہ کے کام میں آئے اور فائدہ بخشے اور اس کی تحصیل میں ہر قسم کی آسانی کرنی چاہیے جب کہ یہ سب میری خواہشیں ہیں تو میں علم کی تحصیل کے واسطے زبان کے ذریعے کو اس لیے از بس ترجیح دیتا

Marfat.com

ہوں کہ اوّل تو طالب علم کو اس میں بہت سی آسانی ہوتی ہے، دوسرے اس کی یہ خاصیت ہے کہ جو علم اس زبان کے ذریعے سکھایا جاتا ہے اُس کا اثر عمل میں بہت قوی اور مفید ہوتا ہے علاوہ اس کے اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے علم خوب شائع ہوتا ہے۔

اگر علم کی تحصیل غیر ملک کی زبان کے ذریعے کی جائے تو اس میں دو چند وقت صرف ہوتا اوّل تو خود زبان ہی کے سیکھنے میں وقت خرچ ہوتا ہے اور اس کی تحصیل میں ہزاروں طالب علم اس قدر وقت کھوتے ہیں کہ پھر اس زبان کے ذریعے سے جس کو انھوں نے حاصل کیا ہے کسی مفید علم کی تحصیل کرنے کے واسطے وقت باقی نہیں رہتا ہے۔ بہت تھوڑے طالب علم ایسے ہوتے ہیں جو بخوبی علم تحصیل کر لیتے ہیں۔ دوسرے علم کی تحصیل خاص علم کے فائدوں کے لحاظ سے ضروری ہوتی ہے اور شاذ و نادر ایسے طالب علم پائے جاتے ہیں جن کو زبان اور علم دونوں کے تحصیل میں کامیابی حاصل ہو۔ مگر جب کہ اس کے دیس کی زبان میں علم کی تحصیل کی جاتی ہے تو طالب علم کا کچھ بھی وقت ضائع نہیں ہوتا اور یہ بات تحقیق ہے کہ ان مضمونوں سے اس کو کچھ کچھ آگہی ہوگی جن پر اس کی رسائی اس حالت میں کہ وہ زبان جس کے ذریعے سے ان مضمونوں کو حاصل کیا غیر ملکی ہوتی اگر غیر ممکن نہ ہوتی تو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے نہایت مشکل ضرور ہوتی۔

ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ ان لفظوں سے کہ تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے ہونی چاہیے ہماری یہ مراد نہیں کہ ایشیا کے علوم و فنون پھر تر و تازہ کیے جائیں اور ان کی تعلیم ہو بلکہ ہم صرف اس بات کے خواست گار ہیں کہ جو علوم و فنون بالفعل یورپ میں مروج ہیں اُنھیں کو شائع کیا جائے

Marfat.com

کیونکہ بجز اس کے ہماری اور کوئی غرض نہیں ہے کہ اہل یورپ کی طرح روشن ضمیری تمام ہندوستان میں عموماً پھیل جائے۔

دو کالج اب ایسے موجود ہیں جن کی سند ہم اپنی تجویز کے مفید ہونے کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ ایک تو ٹامسن سول انجنیئرنگ کالج روڑکی اور دوسرا میڈیکل کالج آگرہ کی شاخ۔ اردو روڑکی کالج کے انگریزی اور اردو فریقوں میں سے ہر ایک کو ایک ہی قسم اور ایک ہی درجے کے علم سکھائے جاتے ہیں یعنی جن کتابوں کی تحصیل اردو فریق کے طالب علم کرتے ہیں وہ کتابیں بالکل اُن کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں جو انگریزی طالب علموں کے استعمال میں ہوتی ہیں۔ امتحان کے سوالات دونوں فریق کے یکساں ہوتے ہیں۔ ایک بند سوالوں کا انگریزی میں اور دوسرا اردو میں دیتے ہیں جو انگریزی کا ٹھیک ترجمہ ہوتا ہے۔ امتحان کے نتیجے بھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں کبھی اردو فریق والے کا طالب علم انگریزی فریق اپنے ہم سر سے بہتر نمبر حاصل کرتا ہے اور کبھی انگریزی طالب علم اپنے ہم سر اردو کے طالب علم سے سبقت لے جاتا ہے۔ دونوں فریق کے طالب علموں کو مساوی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ صرف وہ ذریعہ مختلف ہوتا ہے جس سے وہ علم کی تحصیل کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے میڈیکل کالج آگرہ میں یہ بات معلوم نہیں ہوتی ہے کہ اردو کے طالب علم اپنے انگریزی کے ہم سر طالب علموں سے ان مضمونوں کے بخوبی تحصیل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہوں جو دونوں کو ایک ہی معین حد تک یکساں طریق پر سکھاتے ہیں۔

پس اگر دیسی زبان کو تعلیم کا ذریعہ ٹھہرایا جائے تو اس درجے کا علم جس تک اب چند ایم۔ اے کے سند یافتہ طالب علموں کو رسائی ہوئی ہے بے انتہا لوگوں کو حاصل ہونے لگے گا۔ اب جو سرشتہ تعلیم کا غیر ملکی زبان کے ذریعے سے جاری ہے اُس کی

Marfat.com

بدولت طالب علم جس علم کو ایک مرتبہ حاصل کرتا ہے اُس کو
وہ یونی ورسٹی کے چھوڑنے اور زندگی کے معمولی کام کاج میں
مصروف ہونے کے بعد جلد بھول جاتا ہے اور جلد اس کے ذہن
سے وہ علم اُتر جاتا ہے۔ مگر جو طریقہ ہم نے تجویز کیا ہے اُس
کے ذریعے سے جو علم ایک مرتبہ حاصل ہوجائے گا صرف وہی
باقی اور برقرار نہیں رہے گا بلکہ علم کے تحصیل کا ذریعہ اس
معمولی زبان کے ہونے سے جس میں ہر وقت اس کے خیالات
ظاہر اور پیدا ہوتے ہیں وہ علم طالب علم کی استعداد اور قابلیت
کی مناسبت سے ہمیشہ ترقی اور شگفتگی پاتا رہے گا۔

اس بات کا خیال کرنا بے جا ہے کہ دیسی زبان کے ذریعے سے
اعلا درجہ کی تعلیم کرنا انگریزی زبان کی اشاعت کو مضر اور ہارج
ہوگا۔ کیونکہ یہ کہنا بھی تو اسی طرح سے صحیح نہیں ہے کہ نہر اور
سڑکوں دونوں کا ایسے مقاموں میں بنانا جہاں دونوں کی
ضرورت ہے مضر اور ایک دوسرے کا مخالف اور مانع ہوگا حالانکہ
یہ دونوں کام ایسے جداگانہ ہیں کہ اپنی ذات سے ہر ایک فیض
بخش ہے اور ایک دوسرے کا ہارج اور مزاحم نہیں۔ انھیں
وجوہات سے تعلیم کا انگریزی میں ہونا ایسے دو متفرق کام ہیں کہ
دونوں ایک اچھے نتیجے کے ممد و معاون ہیں۔ حقیقت میں وہ
دونوں دو جدا جدا آلے ایک ہی قسم کے نتیجوں کے حاصل
کرنے کے لیے ہیں۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں بلکہ اچھی طرح یقین
ہے کہ اگر اہلِ یورپ کے علموں اور ان کے نتیجوں کی تعلیم
دیسی زبان کے ذریعے سے کی جائے تو اس سے انگریزی زبان کی
تحصیل کرنے کی خواہش پیدا ہوگی اور ہندوستانیوں میں انگریزی
کے عموماً پھیلنے میں اُس سے بڑی مدد ہوگی۔ بالفعل ہندوستانیوں
میں ان علموں اور فضل کی تعظیم و تکریم بہت سی نہیں ہے جو
اہلِ یورپ کو حاصل ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یورپ کی

سائنٹفک سوسائٹی اسی کام کو انجام دے رہی ہے۔ اس نے حال ہی میں ایلفنسٹن صاحب کی مشہور تاریخ ہندوستان کا ترجمہ مشتہر کیا ہے جو ایک کتاب یونی ورسٹی کے امتحان کے مضمونوں میں سے ہے اور آئندہ بھی وقتاً فوقتاً سوسائٹی اسی قسم کے ترجمے چھاپتی رہے گی۔

خاتمے پر ہم اپنا یہ قوی یقین ظاہر کرتے ہیں کہ جس تجویز کی ہم تائید کرتے ہیں اگر اس کو جاری کیا جائے تو اس ملک کی حالت کو از سرِ نو عمدہ اور بہتر کرنے اور اس کے باشندوں کی طبیعتوں میں سے غلطی اور جہالت کے دور کرنے اور سب حاکم محکموں کو برابر بہت سا فائدہ پہنچانے کا، یہ تجویز ایک بڑا مؤثر وسیلہ اور ذریعہ ہوگی ہم اس لیے نہایت ادب اور بھروسے کے ساتھ اُمید رکھتے ہیں کہ ہماری روشن ضمیر گورنمنٹ ہند جس نے اپنی ہندوستانی رعایا کی بہبودی اور ترقی کے لیے ہمیشہ اپنی آرزو اور فکر ظاہر کی ہے اس بڑے پایہ کی تجویز پر جواب ہم پیش کرتے ہیں اپنی نہایت سنجیدہ اور پسندیدہ توجہ فیاضی سے کرے گی۔

الٰہی آفتابِ دولت و اقبال ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہے (۱)۔

اس عرض داشت کا جو جواب گورنمنٹ کی طرف سے وصول ہوا اس کی نقل بجنسہ یہاں درج کی جاتی ہے۔

نمبر ۴۲۱۷

از جانب ای، سی، بیلی صاحب بہادر

سکریٹری گورنمنٹ ہندوستان

بنام

پریسیڈنٹ و ممبران

برٹش انڈین ایسوسی ایشن ممالک مغربی و شمالی

صیغۂ ہوم ڈپارٹمنٹ

مقام شملہ، ۵ ستمبر ۱۸۶۷ء

Marfat.com

اے شریف صاحبو

۱۔ حضور وایسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری کی معرفت آپ کو پہلے اس امر کی اطلاع ہو چکی ہے کہ آپ کی عرض داشت درباب تعلیم کے موَرخہ، ماہ گزشتہ حضور گورنر جنرل باجلاس کونسل کے حضور میں اس صیغہ میں پیش کی جائے گی، چنانچہ اب مجھ کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کی عرض کو بغور تمام ملاحظہ کرنے کے بعد جو رائے حضور محتشم الیہ نے ثبت فرمائی ہے اس سے آپ کو اطلاع دوں۔

۲۔ سنہ ۱۸۵۴ء کے مراسلۂ تعلیم میں خلاصہ دفعہ ۱۱ سے لغایت ۱۴ کا ملفوف ہے، جس میں وہ بڑے بڑے قول مندرج تھے جن کے بموجب اس سال سے اس ملک کی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے، یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ لوگوں کی تعلیم کے واسطے دیسی زبانوں کو بطور ذریعے کے قرار دینا نہایت ضرور ہے اور حضور گورنر جنرل اس بات کے دیکھنے سے نہایت خوش ہیں کہ جو رائیں مراسلہ مذکور میں بیان کی گئی ہیں اُن کے مطالب کی تصدیق نہایت اچھی طرح پر اس عرضی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ جو آپ نے گزرانی ہے۔

۳۔ مراسلۂ مذکور الصدر میں محکمہ ڈائرکٹروں نے یہ بیان فرمایا تھا کہ ان کا نہ تو یہ ارادہ ہے اور نہ یہ خواہش ہے کہ ملک کی دیسی زبانوں کی بجائے انگریزی زبان قائم کریں اور صاف یہ رائے تحریر فرمائی تھی کہ یورپ کی ترقی یافتہ علم کی کسی قسم کی واقفیت جو ایسے بہت سے لوگوں کو سکھلایا جائے جو اپنی حالتوں کے باعث سے اعلا درجے کی تعلیم نہیں حاصل کر سکتے ہیں اور جن کی ذات سے یہ بھروسہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک غیر ملک کی زبان کی مشکلوں پر غالب آئیں گے، صرف ان دیسی زبانوں میں سے کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سے اُن کو حاصل

Marfat.com

ہو سکتی ہے علاوہ اس کے یہ بات بیان کی گئی تھی کہ انگریزی کا سیکھنا جو علم یورپ کے واسطے بطور ایک کنجی کے ہے اُن ہندوستانیوں کے واسطے صارور ہوگا جو ایک اعلا درجے کی تعلیم کے حاصل کرنے کے واسطے کوشش کرتے ہیں۔

۴- پس دیسی زبانوں اور انگریزی زبان کے درمیان میں ایک فرق عظیم قرار دیا گیا تھا، یعنی یہ کہ ایک عام پسند تعلیم کے واسطے دیسی زبان ہی صرف ایک ذریعہ لابدی ہے اور اعلا درجہ کی تعلیم کے واسطے انگریزی زبان ایک ضروری لوازمہ ہے۔

لیکن ایک طرف تو عام پسند تعلیم اور دوسری طرف اعلا درجے کی تعلیم کی ان دو حدود کے درمیان میں علم کے بہت سے درجے ایسے تھے جن کو دیسی یا انگریزی زبان کے ذریعے سے سکھلانے کے واسطے کوئی خاص خاص قواعد مقرر نہ ہوسکے۔ اب تک جیسا کہ مراسلۂ مندرجہ بالا میں مذکور ہوا ہے، مشرق کی دیسی زبانوں میں یورپ کی کتابوں کے ترجموں کے نہ ہونے یا دیسی ہی اصل کتابوں کے نہ ہونے سے ان لوگوں کے واسطے جو عمدہ تعلیم کے خواہاں تھے یہ ضرور تھا کہ اوّل اوّل انگریزی زبان سیکھیں لیکن یہ ضرورت کچھ ایسی نہیں سمجھی گئی تھی کہ وہ غالباً ہمیشہ جاری رہے گی، کیوں کہ مراسلہ مذکور میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس قدر روز بروز لوگ دیسی زبانوں کی قدر و منزلت کو پہچانتے جاتے ہیں اُسی قدر ہندوستان کا دیسی علم بھی بذریعہ ترجمہ یورپ کی کتابوں یا ان شخصوں کی اصلی تصنیفات کے جن کی طبیعتوں میں یورپ کی شائستگی کی بو سما گئی ہے مالا مال ہوجائے گا اور اس طریق سے تمام فرقوں کی رسائی رفتہ رفتہ یورپ کے علم تک ہوجائے گی۔

۵- اس میں کچھ شک نہیں ہوسکتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۴ء میں اس قدر ضروری مقصد کے باب میں کسی قدر ترقی خصوصاً یورپ کی

کتابوں کے اس ملک کی دیسی زبانوں میں ترجمہ ہوجانے سے ہوئی ہے اور آئندہ جو اظہار خواہش اور لیاقت کا ہندوستان کے باشندوں کی جانب سے اس ترقی کی مدد دینے کے واسطے ہوگا اس کے ملاحظہ سے حضور گورنر جنرل بہادر کو بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ اس بات کے دیکھنے سے نہایت خوشی حاصل ہوتی ہے کہ جو عرض داشت اس وقت گورنمنٹ کے روبرو پیش ہے اس میں صاف صاف دیسی زبان کے علم کو ترقی دینا اس نظر سے ضرور سمجھا گیا ہے کہ جمہور انام کو اعلا درجے کی تعلیم دینے کے واسطے وہ بطور ایک ذریعے کے کار آمد ہو اور جناب نواب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل ان تدبیروں کا ذکر دیکھ کر جو علی گڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے اس باب میں اختیار کی ہیں اپنی رضامندی خاص ظاہر فرماتے ہیں۔

۶۔ دیسی زبان علم کی ترقی کے واسطے ہر سال ملک کے خاص خاص صوبوں کی لوکل گورنمنٹوں اور ریاستوں کو روپیہ بطور امداد کے سپرد کردیا جاتا ہے جو مختلف سررشتۂ تعلیم کی اردو کتابیں واسطے فروخت اور تقسیم کے طبع یا خرید کرلیتے ہیں اس سے بھی وہی مقصد مطلوب ہے۔ اس قسم کے اور ایسے ہی اور ذریعوں سے جو وقتاً فوقتاً معلوم ہوں گے جناب نواب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل کو اُمید ہوتی ہے کہ ہندوستان کی دیسی زبانیں اعلا درجے کی تعلیم دینے کے واسطے بطور ذریعے کے زیادہ تر کار آمد ہوں گی اور حضور محتشم الیہ کا ہمیشہ یہی مقصد ہوگا کہ افسران سررشتہ تعلیم کے روبرو اس ضروری معاملہ کو بڑی نمود کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور مقصد مطلوبہ کے حاصل کرنے کے باب میں ہر ایک قسم کی مدد عطا کریں۔

۷۔ بلحاظ ان درخواستوں کے جو عرض داشت کی دفعہ ۱۲ میں کی گئی ہیں جناب گورنر جنرل بہادر باجلاس کونسل خیال فرماتے

ہیں کہ یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ اس ملک کی دیسی زبانوں سے ابھی اس اعلا درجے کی تعلیم کے واسطے سامان و لوازمہ حاصل نہیں ہے جیسی کہ برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے سوچی ہے۔ یقین ہے کہ جو کتابیں امتحان یونی ورسٹی کی فہرست میں مندرج ہیں ان میں سے بہت سی کتابوں کا ترجمہ نہیں ہوا ہے اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صرف اُن کتابوں کا ترجمہ بھی جو یونی ورسٹی خاص کر واسطے درس کے مقرر کرتی ہے اس قدر کافی نہ ہوگا جس سے تدبیرات مجوزہ کے جاری کرنے کی ہمت پڑے کیونکہ تعلیم یونی ورسٹی کا مقصد صرف یا خاص کر یہ ہی نہیں ہے کہ بعض خاص کتب ہی سے واقفیت حاصل ہو بلکہ یہ مقصد ہے کہ یورپ کے علوم وفنون کے فراخ دائرہ میں علم کی پیروی کے واسطے طبیعت کو مستعد و تیار کرے اور کچھ عرصے تک غالباً ہندوستان کے باشندے صرف انگریزی کے ذریعے سے اس بات کو حاصل کرسکتے ہیں۔

۸۔ لیکن اسی کے ساتھ جناب نواب گورنر جنرل باجلاس کونسل اور نیز تمام لوکل گورنمنٹیں نہایت خوشی سے ان تمام کوششوں کی قدردانی اور مدد کریں گی جو خواہ تو ایسی سوسائٹیاں جیسے کہ آپ کی ہے یا خاص خاص آدمی اس مقصد کی ترقی دینے کے واسطے کریں جو آپ کی سوسائٹی اور گورنمنٹ کو برابر منظور نظر ہے اور ہمیشہ اس معاملہ کی نسبت عملی رایوں کے معلوم کرنے اور ان پر بخوبی تمام اور نہایت غور کے ساتھ توجہ کرنے سے نہایت خوش ہوں گے۔

۹۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے جیسا کہ وزیر سلطنت نے بھی اپنے مراسلہ تعلیم مرقومہ سنہ ۱۸۶۱ء میں بیان کیا ہے کہ در صورت پسندیدہ ہونے کے بعد بھی گورنمنٹ کے واسطے یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے گنجان آباد ملک کو جیسے کہ ہندوستان ہے

Marfat.com

ایک کامل تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمہ لے۔ گورنمنٹ کو دولت مند لوگوں سے اس بات کی توقع کرنی چاہیے کہ وہ اپنی رضا ورغبت سے اپنے وقت اور روپیہ اور رعب وداب سے ایسے کام میں مدد دیں جس کی تکمیل پر ہندوستان کی بہبودی اور ترقی زیادہ تر منحصر ہے۔

۱۰۔ سوائے اس کے یہ بھی واضح ہو کہ صرف خاص خاص لوگوں یا ان کے گروہوں کی مذکورہ بالا کوششوں کی بدولت عموماً یورپ کے ملکوں میں تعلیم کثرت سے پھیل گئی ہے اور در حقیقت یہ ایک ایسا کام ہے کہ کوئی گورنمنٹ کامیابی کی کسی اُمید سے اس کو بالکل اپنے ذمہ نہیں لے سکتی۔

آپ کا خادم
سکریٹری گورنمنٹ ہند

اس چٹھی کے فقرہ ۲ میں جس مراسلۂ تعلیم کے خلاصے کا حوالہ ہے وہ یہ ہے:

انتخاب مراسلہ کورٹ آف ڈائریکٹرس
ایسٹ انڈیا کمپنی
بنام
گورنر جنرل ہندوستان
مورخہ ۱۹ جولائی سنہ ۱۸۵۴ء
نمبر ۴۹

۱۱۔ اب ہم کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ ہمارے مقصد کی تکمیل کس طرح پر ہو سکتی ہے اور اُس سے ہم کو اس ذریعے کے بحث پر توجہ ہوتی ہے جس سے ہندوستان کے لوگوں کو علم کی تعلیم کی جائے اب تک ہندوستان کی دیسی زبانوں میں یورپ کی کتابوں کا ترجمہ نہ ہونے سے یا دیسی اصل کتابوں کے نہ ہونے سے اور مشرقی اعلا درجے کی زبانوں میں یورپ کے علم کی

نہایت ناقص کتابوں کے ہونے سے ان لوگوں کے واسطے جو عمدہ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہوں اب تک اس بات کی ضرورت ہے کہ انگریزی زبان کو یورپ کے علم کی کنجی سمجھ کر اوّل اوّل اُسی کی تحصیل شروع کریں اور انگریزی کا علم ہمیشہ ہندوستان کے اُن باشندوں کے واسطے جو اعلا درجے کی تعلیم حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں، ضرور ہوگا۔

۱۲- ہندوستان کے بعض حصّوں میں خصوصاً صدر مقاموں کے قرب و جوار میں جہاں کہ انگریزی کا علم رکھنے والوں کو بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری نوکریوں کے لیے اور لوگوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ وہ لوگ جو مدرسوں میں پڑھتے ہیں انگریزی کے اوسط درجے کی استعداد کو اپنے عام علم کی ترقی کا ضروری سلسلہ نہیں بلکہ اپنی تعلیم کا مقصد اور مالِ کار سمجھتے ہیں۔ ہم بہت سی باتوں میں صرف انگریزی بولنے اور لکھنے کی لیاقت کے فائدہ سے منکر نہیں ہیں لیکن ہم کو خوف ہے کہ ان اصلاع میں کچھ ایسا ڈھنگ پڑگیا ہے کہ دیسی زبانوں کی تعلیم کی جانب سے بے جا غفلت کی جاتی ہے۔

۱۳- ہمارا یہ ارادہ یا خواہش نہیں کہ ملک کی دیسی زبانوں کے بجائے انگریزی زبان کو قائم کریں۔ ہم ہمیشہ سے یہ بات جانتے ہیں کہ جن زبانوں کو صرف جمہورانام کے بہت سے فرقے سمجھ سکتے ہیں اُنھیں کا رواج نہایت ضرور اور مفید ہے۔ ہم نے یہی زبانیں نہ انگریزی زبان بجائے فارسی کے داد رسانی کے محکموں اور گورنمنٹ کے افسروں اور لوگوں کے درمیان میں معاملات کے واسطے قائم کی ہے۔ پس یہ ضرور ہے کہ تعلیم کے کسی عام انتظام میں اُن کی تحصیل پر بڑی توجہ کی جائے اور یورپ کے ترقی یافتہ علم کی کوئی واقفیت جو جمہورانام کے ان بہت سے فرقوں کو سکھلایا جاوے جو اپنی حالتوں کے باعث

سے ایک اعلا درجے کی تعلیم حاصل کرنے سے معذور ہیں اور جن کی ذات سے یہ توقع نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ ایک غیر زبان کی مشکلوں پر غالب آویں گے ان دیسی زبانوں میں سے کسی نہ کسی زبان کے ذریعے سے ان کو حاصل ہو سکتی ہے۔

۱۴۔ تعلیم کے کسی عام سرشتہ میں انگریزی زبان ان مقاموں میں سکھلانی چاہیے جہاں اس کی خواہش ہو لیکن انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ ہمیشہ ضلع کی دیسی زبان کی تحصیل پر بڑی توجہ اور ایسی عام تعلیم و تلقین ہونی چاہیے جو اس زبان کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور جس صورت میں کہ انگریزی زبان کا استعمال بطور ایک نہایت کامل ذریعے کے واسطے تعلیم ان شخصوں کے جاری رہے جن کو اس سے اس قدر واقفیت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے عام تعلیم و تلقین حاصل کر سکتے ہیں تو اُن کو بہت سے فرقوں کے سکھلانے کے واسطے جو انگریزی زبان سے بالکل ناواقف ہیں یا کم واقف ہیں دیسی زبانوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ اس کا انجام ایسے ماسٹروں اور پروفیسروں کی معرفت بخوبی تمام ہو سکتا ہے جو خود انگریزی داں اور جو ترقیاں حال میں ہر ایک قسم کے علم میں ہوئی ہیں اُن سے بخوبی واقف ہو کر اپنے ہم وطنوں کو اپنے وطن کی زبان کے ذریعہ سے وہ علم سکھلا سکتے ہیں جو انھوں نے بذریعہ انگریزی کے حاصل کیا ہے۔ اسی کے ساتھ میں اور جس قدر کہ روز بروز دیسی زبان کی قدر کو لوگ پہچانتے جائیں ہندوستان کی دیسی زبان کا علم انگریزی کتابوں کے ترجمے یا ان شخصوں کی اصلی تصنیفات کے ذریعے سے جن کے دل میں یورپ کی شائستگی کی بو سما گئی ہو رفتہ رفتہ مالا مال ہو جائے گا اور اس طرح پر تمام فرقے رفتہ رفتہ یورپ کے علم کو حاصل کر سکیں گے۔ پس ہم انگریزی زبان اور نیز ہندوستان کی دیسی زبانوں کو ذریعہ اشاعت علم یورپ کا سمجھتے ہیں اور ہماری

Marfat.com

یہ خواہش ہے کہ جو مدرسے ایسے اعلا درجے کے ہوں جن میں ایک ایسا مدرس رہ سکتا ہو جس میں تمام ضروری لیاقتیں موجود ہوں ان سب میں انگریزی اور دیسی غرض کہ زبانوں کی تحصیل ہووے"۔

سرسید نے گورنمنٹ کا یہ جواب برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے جلسے میں پڑھ کر سنایا۔ ایسوسی ایشن کے ممبروں نے مندرجہ ذیل تجویز منظور کی۔ اس تجویز میں جو "دونوں سوسائٹیوں" کا لفظ ہے اُس سے مراد برٹش انڈین ایسوسی ایشن اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ ہے۔

"بعد سننے مضامین چٹھی موصوفہ کے صدر انجمن نے فرمایا کہ جو بے بہا توجہ ہماری فیاض اور عادل گورنمنٹ نے ہماری عرض داشت معروضہ یکم اگست سنہ ۱۸۶۷ء پر فرمائی ہے کسی طرح اس کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا۔

چونکہ یہ جواب اور عرض داشت جملہ ترقی علم سے متعلق ہیں لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ممبران سائنٹفک سوسائٹی بھی اس معاملہ پر غور کریں اس واسطے میں تحریک کرتا ہوں کہ ایک جلسہ بشرکت ممبران دونوں سوسائٹیوں کے کیا جائے اس تحریک کی تائید بابو ایشر چندر مکرجی صاحب نے کی اور بالاتفاق یہ بات قرار پائی کہ سوسائٹی کے ممبروں کو اس امر میں گفتگو کرنے کی غرض سے اجلاس میں تشریف لانے کی تکلیف دی جائے" (۲)۔

سرسید نے ایسوسی ایشن کی عرض داشت اور گورنمنٹ کا جواب بغرض اظہار رائے ایک انگریز عالم کے پاس بھیجی۔ جن الفاظ میں سرسید نے اس کا ذکر کیا ہے اور جو جواب اُس انگریز عالم کی جانب سے وصول ہوا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"اس ایسوسی ایشن کے سکریٹری نے ایک نقل اس عرض داشت کی جو درباب وسعت تعلیم اہل ہند حضور میں جناب معلی القاب رائٹ آنریبل وائسرائے اور گورنر جنرل بہادر کشور ہند بھیجی گئی ہے مع اس کے جواب کے ایک بہت بڑے یورپین عالم کے پاس جس کے برابر ہندوستان میں چند ہی انگریز عالم ہوں گے اس مراد سے بھیجی تھی کہ وہ اپنی رائے اس امر میں جس کی درخواست گورنمنٹ سے کی گئی ہے ارقام فرماویں۔ اگرچہ ہم اِن صاحب کا نام نہیں بتاتے ہیں مگر جو کہ ایک بہت بڑے

Marfat.com

عالم کی رائے اور قابل توجہ حضور وائسرائے و گورنر جنرل بہادر کشور ہند کی ہے اس لیے ہم اس، کو بحذف ان کے نام و نشاں کے اس اخبار میں درج کرتے ہیں"۔

نقل چٹھی صاحب ممدوح بنام سکریٹری ایسوسی ایشن

مقام ۲۷ اگست سنہ ۱۸۶۷ء

میرے عزیز صاحب!

"میں نے آپ کی درخواست بہت دل لگا کر پڑھی اور نہایت صدق دل سے اس نہایت مناسب جواب کی مبارک باد دیتا ہوں جو جناب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر نے آپ کے پاس بھیجا ہے میری دانست میں اس امر میں مطلقاً شبہ نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ کی تجویز مجوزہ موجودہ یونی ورسٹی کے اثر ہائے فائدہ بخش کو نہایت وسعت دے گی، کیونکہ ہزاروں آدمی جو بسبب بعض حالات کے تحصیل علم انگریزی سے محروم ہیں علم مغربی کی تحصیل پر آمادہ ہوں گے اور اس کے ساتھ یہ بھی فائدہ ہوگا کہ اس ملک کی عمدہ زبانوں کو باحتیاط اور بطرز عالمانہ تحصیل کریں گے۔

علوم ریاضی و تواریخ و جغرافیہ اور وہ علم جن سے اخلاق اور عقل کی تہذیب اور ترقی ہوسکتی ہے، ہندوستان کی ہر دیسی زبان میں اس خوبی کے ساتھ ہوسکتے ہیں جیسے کہ انگریزی میں بشرطیکہ ان علوم کی عمدہ عمدہ کتابوں کے خاطر خواہ ترجمے اور لئیق مدرس دستیاب ہوں۔ فی الواقع آپ کی تدبیر کی تکمیل کے لیے وقت اور بہت سے بڑے بڑے عالموں کی باہمی کوشش کی ضرورت ہوگی، لیکن مجھے یقین واثق ہے کہ یہ امر ممکن التکمیل ہے اور یقینی اس سے فوائد بے شمار پیدا ہوں گے۔

آپ اس امر کا یقین کامل رکھیں کہ جو کچھ اعانت قلیل میں دے سکتا ہوں ہمیشہ برضا و رغبت تمام دوں گا۔

آپ کا صادق" (۳)

عرض داشت میں اس امر کو صاف اور صریح الفاظ میں بیان کردیا گیا ہے کہ ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ ایشیا کے مردہ علوم فنون کو تر و تازہ کیا جائے، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اُن علوم و فنون کی جو اہل یورپ نے اس زمانے میں اپنی جدوجہد اور تحقیقات سے حاصل کیے ہیں ملک میں عام اشاعت کی جائے۔ گورنمنٹ نے جو ملک میں مغربی تعلیم جاری کی ہے اُس کا احسان مندی کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن موجودہ

حالت میں رعایا کی صرف ایک قلیل تعداد اس سے فائدہ حاصل کر سکتی ہے اور عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔ اس لیے جب تک دیسی زبان کے ذریعے سے تعلیم نہ دی جائے گی ملک میں روشن خیالی نہیں پھیل سکتی اور تعلیم کا اصل مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کو پرزور الفاظ میں جتایا گیا ہے کہ اس تحریک سے ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ انگریزی تعلیم گھٹادی جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یا تو کلکتہ یونی ورسٹی میں ایک شعبہ ایسا قائم کیا جائے کہ اس میں دیسی زبان کے ذریعے سے علوم وفنون کی تعلیم اسی درجے تک دی جائے جو انگریزی میں دی جاتی ہے اور اسی قسم کے امتحان لیے جائیں اور ویسی ہی سندیں عطا کی جائیں یا ممالک مغربی شمالی میں ایک یونی ورسٹی دیسی زبان کی علاحدہ قائم کی جائے۔ اس امر کا بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ بالفعل دیسی زبان میں ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جن کے ذریعے سے طالب علم اس درجے تک علم کی تحصیل کرسکے جو اس وقت یونی ورسٹی میں امتحان دینے کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن ایسی کتابوں کا موجود ہوجانا کوئی مشکل امر نہیں ہے، جو کتابیں یونی ورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں ان کے ترجمے دیسی زبان میں تیار ہوسکتے ہیں اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ بہت سے اہل علم اس کام کے لائق موجود ہیں اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اس کام کو انجام دے رہی ہے۔

یہ ہے خلاصہ عرض داشت کا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب اس کا وصول ہوا اس میں چند باتیں قابل غور ہیں۔ گورنمنٹ اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ جمہور انام کو اعلا درجے کی تعلیم دینے کے لیے دیسی زبانیں کار آمد ہوں گی لیکن دیسی زبانوں میں ابھی اس اعلا درجے کی تعلیم کے لیے کافی سامان اور لوازمہ موجود نہیں ہے۔ دوسری بات جو زیادہ قابل لحاظ ہے یہ ہے کہ صرف ان کتابوں کا ترجمہ، جو یونی ورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اس قدر کافی نہ ہوگا کہ جس کی بنا پر اس تجویز کو عمل میں لانے کی ہمت ہوسکے۔ تعلیم یونی ورسٹی کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بعض خاص خاص کتب سے واقفیت ہوجائے بلکہیہ مقصد ہے کہ یورپ کے علوم وفنون کے فراخ دائرے میں علم کی تحصیل کے لیے طبیعت کو مستعد اور تیار کیا جائے اور کچھ عرصے تک غالباً ہندوستان کے باشندے صرف انگریزی کے ذریعہ سے اس بات کو حاصل کرسکتے ہیں۔ تیسری بات جس کا گورنمنٹ نے اظہار کیا ہے کہ "در صورتِ پسندیدہ ہونے

Marfat.com

کے بھی گورنمنٹ کے واسطے یہ غیر ممکن ہے کہ ایسے گنجان آباد ملک کو جیسا کہ ہندوستان ہے کامل تعلیم دینے کا کل خرچ اپنے ذمہ لے"۔ یعنی ملک کے اہلِ دولت کو بھی اپنی رضا و رغبت سے اپنے وقت، روپے، اثر سے اس کام میں مدد دینی چاہیے جس کی تکمیل پر ہندوستان کی بہبودی اور ترقی کا انحصار ہے۔

اس خط و کتابت کے بعد پھر کچھ معلوم نہ ہوا کہ کیا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ یہیں ختم ہوگیا۔ مولانا حالی "حیات جاوید" میں لکھتے ہیں: "معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونی ورسٹی کو توڑ کر اس کی جگہ ورنیکلر یونی ورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو بطور سکنڈ لینگویج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ سرسید نے بنارس انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسے میں جو اسی معاملے پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ:

"مسٹر کیسن (ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم اضلاع شمال مغرب) نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی بطور ایک زبان کے سکھلائی جائے اور اس کو اعلا تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اس کے ساتھ ایک اور سر رشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات دیسی زبان کے ذریعے سے بکثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں۔ پس یا تو کلکتہ یونی ورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہوا یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونی ورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو۔

"اس کے بعد اپریل سنہ ۱۸۶۸ء میں جب کہ نواب لفٹننٹ گورنر بھی بنارس انسٹی ٹیوٹ میں موجود تھے سرسید نے پھر اسی تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ "مجوزہ ورنیکلر یونی ورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا ہرگز تنزل نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروڑھا آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیوں کر پہنچے"۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "غالباً زیادہ تر اسی وجہ سے کہ گورنمنٹ کا ارادہ انگریزی تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا سرسید نے ورنیکلر یونی ورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہوگا، مگر

اس کے سوا خود ورنیکلر یونی ورسٹی کے قائم کرنے میں، بعض مشکلات ایسی تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ سرسید نے اس باب میں جب مسٹر پیرسن انسپکٹر مدارس حلقۂ راولپنڈی سے رائے دریافت کی تو انھوں نے اُس کے جواب میں ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں ترجمہ کرنے کی اصلی اور حقیقی مشکلات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں۔

اس تحریر سے بھی ضرور ان کے ارادوں میں تزلزل واقع ہوا ہوگا۔ پھر انھیں دنوں میں اُن کو سفرِ انگلستان کا خیال پیدا ہو گیا جس میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں اور اُن کا حل کرنا بجائے خود ایک بڑا کام تھا۔ ان وجوہ سے سرسید اور ان کے ساتھ کے جتنے آئین کہنے والے تھے سب ورنیکلر یونی ورسٹی کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔

"ورنیکلر" سے سرسید اور اُن کے رفقا یعنی ارکان برٹش انڈین ایسوسی ایشن و ارکان سائنٹفک سوسائٹی کی (جن میں ہندو مسلمان اور انگریز سب شریک تھے) مراد اردو زبان سے تھی کیونکہ ہندی زبان کی حیثیت اُس وقت ایسی نہ تھی کہ اس بار کی متحمل ہو سکتی۔ عرض داشت کے اُس فقرے سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے جس میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ترجموں کا ذکر کیا ہے اور آئندہ ترجموں کا بار اپنے اوپر لینا قبول کیا ہے۔ علاوہ اس کے اس سے قبل اس کا تجربہ دہلی کالج میں ہو چکا تھا جہاں تمام ترجمے اور تالیفات اردو ہی میں ہوئی تھیں اور مختلف علوم وفنون کی اعلا تعلیم اردو ہی کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ چنانچہ (جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا ہے) گورنمنٹ کی طرف سے عرض داشت کے جواب آنے پر بڑے بڑے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی ہامی بھری تھی جن میں تین نامور آدمی دلی کے بھی تھے، ماسٹر پیارے لال، مولوی ذکاء اللہ اور پنڈت دھرم نراین۔ یہ تینوں صاحب دہلی کالج میں طالب علم اور استاد رہے تھے۔

ملک کی بد نصیبی دیکھیے کہ اگرچہ تجویز مکمل ہونے نہیں پائی تھی اور اس کے عمل میں آنے کی بھی کوئی قوی توقع نہیں تھی مگر زبان کے معاملے میں اختلاف شروع ہو گیا اور اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی کہ مجوزہ یونی ورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے اور "باوجود تسلیم کرنے اس بات کے کہ ہندی زبان سردست ترجمے کی قابلیت نہیں رکھتی اس

امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اس کی ترقی میں کوشش کرکے اس کو ترجمے کے لائق بنایا جائے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز بھی اس تحریک کے مزاحم ہوئی اور کارروائی آگے چلنے نہ پائی۔

دیسی زبان کی یونی ورسٹی قائم کرنے اور اس کے ذریعے اعلا تعلیم دینے کی تجویز سب سے پہلے سرسید نے سوچی۔ اب اتنی مدت کے بعد جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر یہ یونی ورسٹی وجود میں آجاتی تو ہماری زبان کی کیا حالت ہوتی تو ہمارے دل میں عجیب قسم کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ ساٹھ ستر سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی۔ اگر اس مدت میں استقلال، خلوص اور ہوش مندی سے کام کیا جاتا تو ہندوستان کی کوئی زبان اس سے لگا نہ کھاتی۔ یہ تو خیر ایک تجویز تھی، ہمارے وہ ادارے جو اس کام کو بخوبی انجام دے رہے تھے، ایسے وقت میں بند ہوگئے یا سست پڑ گئے جب کہ اُن کی شدید ضرورت تھی۔ اس سے ہماری زبان کو سخت نقصان پہنچا۔ دہلی کالج جس نے اس عظیم الشان کام کا سب سے پہلے بیڑا اٹھایا اور جہاں اس کے کار فرما اور کارکن بڑے شوق اور جوش سے یہ خدمت ادا کر رہے تھے، بے وقت نشانۂ اجل ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے اسے ایسا دھچکا لگا کہ پھر نہ پنپ سکا اور اس کی ساری کوششوں اور محنتوں پر پانی پھر گیا۔ اس کے بعد سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اس کا ڈول ڈالا تھا اور کام اچھا خاصا چل نکلا تھا اور ورنیکلر یونی ورسٹی کی تجویز اسی کے بانی کا نتیجۂ فکر تھی لیکن کچھ مدت کے بعد وہ بھی رہ گئی۔ پھر اورینٹل کالج لاہور نے اس سلسلے کو کچھ ایسی شُبھ گھڑی میں شروع کیا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تلافی مافات کرکے رہے گا لیکن ایک عرصے کے بعد اس کا کام بھی رک کے رہ گیا۔ اب جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے اس بار عظیم کو اپنے ذمہ لیا ہے اور زیادہ استحکام اور وسعت کے ساتھ اس کام کو انجام دینا شروع کیا ہے۔ اس سے ہماری زبان کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ لیکن زبان کی ترقی کا اس پر انحصار کرکے بیٹھے رہنا دانش مندی کے خلاف ہے۔ اس وقت ایسے اسباب پیدا ہوگئے ہیں کہ ہمیں زیادہ فکر اور مستعدی کے ساتھ اس کے سنبھالنے اور اس کی توسیع و اشاعت پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مشاعرے اور برائے نام انجمنیں اس کام کو انجام نہیں دے سکتیں۔ اس کے لیے باہمی اتحاد اور زندہ مرکز کی ضرور ہے۔

Marfat.com

گیا تھا۔ اس میں لفٹیننٹ کرنل گریہم نے (جو سرسید کے بڑے دوست تھے اور اس وقت غازی پور میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے) اور سرسید نے بہت مدلل اور معقول تقریریں کیں۔

سرسید کا یہ خیال بالکل صحیح تھا اور اب بھی تقریباً ۷۰ سال گزرنے اور مغربی تعلیم کی بہ کثرت اشاعت ہونے کے بعد بھی وہ خیال ویسا ہی صحیح ہے کہ علوم جدیدہ کی اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں دیسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "انھوں نے اس بات کو انگریزی زبان کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا"۔ مولانا نے اس سوسائٹی کے مقاصد کو مختصر طور پر نہایت خوبی سے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"جو (یعنی سائنٹفک سوسائٹی) اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کے مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر لکچر دیے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعے سے ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔ ہندو، مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی مغائرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے"۔ ابتدا ہی میں ۱۲۹ ممبر ہوگئے۔ جس میں ہندو مسلمان انگریز سب شریک تھے۔

اس سال (یعنی ۱۸۶۴ء) میں سرسید غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آگئے۔ "چونکہ غازی پوری میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا۔ اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف وہ اپنے ساتھ علی گڑھ لے آئے۔ مسٹر ولیم جنکن بریملی جو اس زمانے میں علی گڑھ کے جج تھے سوسائٹی کے پریسیڈنٹ قرار پائے اور اس وقت سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی اور سرسید کی نگرانی میں عمارت کی تعمیر شروع بھی کردی گئی۔ مکان کی تعمیر اور آرائش اور کتب و آلات وغیرہ پر تقریباً تیس ہزار روپے کی لاگت آئی اس کا سنگ بنیاد لفٹننٹ گورنر شمال مغرب (اے ڈی منڈ) نے ۳ نومبر ۱۸۶۴ء کو رکھا تھا اور ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو جب

Marfat.com

عمارت بن کر تیار ہو گئی تو مسٹر ولیمس کمشنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے اس کا افتتاح ہوا۔ ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند اس کے پیٹرن (سرپرست) اور اے ڈی منڈ لفٹننٹ گورنر شمال مغرب وائس پیٹرن قرار پائے۔ اولین سکریٹری لفٹننٹ کرنل گریہم، اس کے بعد سرسید ہوئے۔

اگرچہ سوسائٹی کا پہلا قانون ۱۸۶۴ء میں بمقام غازی پور بنا لیکن جب سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ میں منتقل ہو گیا تو ۱۸۶۶ء میں اس میں کسی قدر ترمیم کی گئی۔ سوسائٹی کے اغراض و قواعد حسب ذیل قرار دیے گئے:

## لقب اور مقصد

اس مجمع کا نام سین ٹی فک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی کہا جائے گا، اور مقصد اس کا یہ ہوگا۔

۱- ان علوم و فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں، یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

۲- جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کی فہم و فراست کی ترقی مقصود ہو۔

۳- ایشیا کے قدیم مصنفین کی کمیاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کر کر بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

## بناوٹ سوسائٹی کی

۴- سوسائٹی میں (اوّل) معاون ممبر (دوسرے) آنریری ممبر (تیسرے) رفقائے سوسائٹی ہوویں گے اور سوسائٹی کے پے ٹرن یعنی مربی اور وائس پے ٹرن یعنی نائب مربی بھی مقرر ہوا کریں گے۔

معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے (اوّل) ممبران حضوری یعنی وہ ممبر جو ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو (دوسرے)

ممبران مکاتیب یعنی وہ ممبر جو اس مقام سے جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو فاصلے پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسے میں شریک نہ ہو سکیں اور بذریعہ خط و کتابت سوسائٹی سے ارتباط رکھیں۔

تعداد: غیر محدود  چندہ: دو روپیہ ماہانہ

آنریری ممبروں کی تعداد دس سے اور رفقائے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔

صاحبان ڈائرکٹرز پبلک انسٹرکشن بنگال اور شمال مغرب اور سنٹرل انڈیا اور اودھ و پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں آنریری ممبر ہوں گے (۲)۔

رفقائے سوسائٹی ایسے شخص ہوں گے جو سبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں مگر ممبری کے عہدہ پر مقرر ہونے کا ان کو کچھ خیال نہ ہو۔

کونسل مشیر کے ذمہ ترجمہ و ترتیب کتب، ترجموں کی پسندیدگی و ناپسندیدگی نیز یہ تجویز کہ ترجمہ اردو، فارسی، عربی، ہندی میں کیا جائے یا کن کن زبانوں یا کس زبان میں کیا جائے۔

## کونسل کارپرداز، ذمہ دار منتظم اور ایک کتب خانہ کا قیام

جو عمارت سوسائٹی نے علی گڑھ میں بنائی وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کہلائے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا ہر قسم کی عجیب عجیب چیزیں اس مکان میں عجائب خانہ کی غرض سے جمع کی جائیں گی اور ان چیزوں کے حالات وقتاً فوقتاً مشتہر کیے جایا کریں گے۔

۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری ہوا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار تھا۔ پھر ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا۔ ایڈیٹر خود سرسید تھے، مولانا حالی نے اس اخبار کے متعلق جو رائے لکھی ہے وہ اس قدر معقول اور صحیح ہے کہ اس کے بعض حصوں کا یہاں نقل کر دینا کافی ہے:

"اوّل اوّل سرسید زیادہ تر اس میں پولیٹکل معاملات پر مضامین اور نوٹ لکھتے تھے۔ اس لیے ان کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے، اس

لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھاسکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کرکے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔

اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی، علاوہ ان لیڈنگ آرٹیکلوں کے جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر چھپتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت یا تعلیم یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوسائٹی میں دیے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانۂ حال کی نئی اطلاعیں اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی رہی ہیں ان کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اس پرچے کے اجرا سے شروع ہوئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک کسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور دیسی زبانوں سے ممتاز ٹھہراتا تھا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے طرز تحریر میں برخلاف اپنے تمام ہم عصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقے یا کسی خاص شخص کی دل آزاری روا نہیں رکھی۔ اس نے اپنے گاہکوں کے خوش کرنے کے لیے جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور متانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اس کے اہل کاروں پر زہر نہیں اگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی

کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی"۔

یہ سب سچ ہے، لیکن یہ اس وقت تک تھا جب تک کہ کالج اور دوسرے کاموں کا ہجوم نہیں ہوا تھا، آخر میں تو یہ "ماخوذ از پانیر" ہو کے رہ گیا تھا۔ لیکن جب کوئی خاص مسئلہ یا اہم معاملہ آجاتا تھا، تو سرسید خود بڑے پرزور مضامین لکھتے تھے۔

ابتدا میں منشی محمد یار خاں ایڈیٹری کا کام کرتے تھے اور منشی چکھن لال انگریزی اخبارات کا ترجمہ کرتے تھے۔ مولوی فیض الحسن اور بابو گنگا پرشاد مترجم کتب تھے اجرت پر بھی کام ہوتا تھا۔ کل عملہ پانسو روپیہ ماہانہ کا تھا۔

ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا اور آلات علمی اور کلوں کے نمونے فراہم کیے گئے اور لکچروں کا سلسلہ قائم ہوا، ڈاکٹر کلکلی ہر مہینہ ایک لکچر نیچرل سائنس، پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔

سوسائٹی کی ترقی اور فروغ کا سارا دارومدار سرسید پر تھا۔ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور محنت اور سالانہ چندوں اور عطیات، سے سوسائٹی کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پریس جو "تبئین الکلام" کے چھاپنے کے لیے خریدا تھا، سوسائٹی کی نذر کردیا۔ جون ۱۸۶۶ء میں جب، نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال نے یہ سنا کہ سید احمد خاں نے ہندوستانیوں کی بہبودی کے لیے یہ سوسائٹی قائم کی ہے تو انھوں نے بطور اظہار خوشنودی ایک الماس، کی انگوٹھی قیمتی ایک ہزار روپیہ سرسید کو بھیجی۔ سرسید نے ایک جلسۂ عام میں یہ انگوٹھی سوسائٹی کو دے دی۔ اس طرح محض سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کے لیے سرسید نے فوج داری اور کلکٹری کے مختار اور وکیلوں کو قانون پر لکچر دینے شروع کیے اور اس سے جو فیس وصول ہوتی تھی وہ سوسائٹی کی نذر کردیتے تھے۔

گورنمنٹ اور رؤسا امرا اور حکام نے بھی اس کی معقول امداد کی۔ گورنمنٹ نے تین ایکڑ، تین روڈ اور تیس پول زمین سرکاری تعمیر مکان کے لیے اور ایک باغ سرکاری علم فلاحت کی ترقی اور امتحان کے لیے عطا کیا۔ مہاراجہ جودھ پور نے سو روپیہ سالانہ، مہاراجہ کپور تھلہ نے پچاس روپیہ، مہاراجہ جے پور نے پچاس اور نواب رام پور نے سو روپے سالانہ امداد مقرر کی۔ وائسرائے اور لیفٹننٹ گورنر وغیرہ نے چندوں سے مدد کی۔ سرجان لارنس کو خاص توجہ تھی۔ مسٹر ڈریمنڈ لیفٹننٹ گورنر شمال مغرب اور مکلوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بھی چندے دیے۔ نواب کلب علی خاں نے بارہ سو روپے

کی ایک نقرئی کرسی سوسائٹی کو دی۔ مہاراجہ الور اور مہاراجہ اندور اور نواب ٹونک نے عطیات دیے۔ مہاراجہ بنارس کو بھی اس سے خاص دلچسپی تھی۔ عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے دو سو روپے تعمیر چاہ کے لیے دیے۔ سر آکلنڈ کالون، مسٹر سیپٹ کلکٹر میرٹھ اور مسٹر کیمسن ڈائرکٹر تعلیمات بھی اس کے بڑے معاون تھے۔ سرسید کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ سالانہ چندے اور اخبار کی قیمت دس ہزار آٹھ سو پچاس تک پہنچ گئی۔

۱۵ اگست ۱۸۶۷ء میں جب سرسید عہدہ جج اسمال کاز کورٹ پر ترقی پا کر علی گڑھ سے بنارس چلے گئے تو سوسائٹی کا تمام کاروبار راجہ جے کشن داس، سی، ایس، آئی کو جو اس زمانے میں علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد کیا گیا اور انھوں نے بڑی توجہ سے کام کو سرانجام دیا۔ لیکن سرسید بنارس میں رہ کر بھی برابر سوسائٹی کی اعانت کرتے رہے اور ان کے مضامین سوسائٹی کے اخبار میں شائع ہوتے رہے۔

۱۸۶۷ء میں سرسید بہ تقریب تعطیل دسہرہ بنارس سے علی گڑھ آئے اور ضلع علی گڑھ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے، کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اس کی آمدنی مستقل ہو جائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے، اور اس کی شرائط واجب العرض میں بروقت بندوبست کے درج ہو جائیں تاکہ نسلاً بعد نسلاً ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھ عذر نہ کرنے پائے۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کے جلسے میں سرسید نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی مع ان کی عرضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۳ دیہات کے جارج ہنری لارنس کلکٹر ضلع علی گڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعے سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپورٹ کے ذریعے سے روانہ کر دیے۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی پرائیوٹ سکریٹری گورنمنٹ انڈیا مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۶۷ء بنام سرسید وصول ہوئی، اس میں حضور وائسرائے کی طرف سے رضامندی ظاہر کی گئی تھی (۳)۔

۹ مئی ۱۸۶۸ء کو سوسائٹی نے اڈریس سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا اور سوسائٹی کی درخواست پر سر ولیم میور نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں دیسی زبان میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی جائیں ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔

چنانچہ ۲۶ اگست ۱۸۶۸ء کو گورنمنٹ شمال مغرب نے دیسی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا۔ "اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی میعاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو دیسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اس لیاقت کو کام میں لانا نہیں چاہتا تھا برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے۔ خصوصاً اردو لٹریچر صرف اس تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار مذکور نے ملک میں عموماً پیدا کر دی تھی تھوڑے عرصے میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا" (۴)۔

سرسید کی دور اندیشی سوسائٹی کے نام سے ظاہر ہے۔ اس زمانے میں جدید خیالات کی اشاعت اور سائنس کا ذوق پیدا کرنا بہت بڑا کام تھا۔ جب سوسائٹی علی گڑھ میں منتقل ہوئی تو اس نام کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور سرسید بھی کسی طرح مائل ہو گئے تھے کہ یہ نام بدل جائے لیکن جب طریقہ و علم کاشت کاری اور علمی عجائبات کا رہنما طے ہو گیا تو یہی نام مناسب خیال کیا گیا اور آخر تک یہی نام قائم رہا۔

سائنس کے لکچروں کے علاوہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے عملی تجربے بھی کیے گئے اور علم فلاحت کے اصول کے مطابق سوسائٹی کے باغ میں گیہوں بویا گیا اور جب تیار ہو گیا تو جلسے میں اس کا نمونہ دکھایا گیا۔ ایک ایک دانے میں ساٹھ ساٹھ شر شر شاخیں نکلیں اور بعض میں سو سے بھی زیادہ پھوٹ کر مثل پولے کے جھنڈ کے ہو گیا تھا۔ پودے کا طول ۴ فٹ ۸ انچ اور بال مع تور کے ایک انچ لمبی تھی۔ نو قسم کے گیہوں لندن سے منگائے گئے۔ خود سرسید نے ایک ایک دانہ بونے کے لیے ایک آہنی نلی ایجاد کی اور علم فلاحت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا۔

مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی تالیف اور مغرب اور مشرق کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ اس سوسائٹی کا ایک بہت بڑا مقصد تھا۔ علمی ذوق پیدا کرنے کا یہ بہت

Marfat.com

بڑا ذریعہ تھا۔ سرسید نے پولیٹکل اکانمی، نیچرل فلاسفی، علم آب و ہوا کے ترجموں کی سفارش کی۔ کرنل جے ڈبلیو ہیملٹن نے پہلے ہیروڈوٹس کی "تاریخ مصر" کے ترجمے کا اور بعدازاں تمام تاریخ کے ترجمے کا مشورہ دیا اور لکھا کہ مقالوں اور شخصیتوں کے ناموں کے معاملے میں بہ نسبت یونانی کے عربی زبان کی پیروی کرنی چاہیے اور جو تلفظ کسی لفظ کا یورپ یا ایشیا کی زبان میں مروج ہو وہی اختیار کیا جائے۔ انگریزی زبان کی تقلید لازم نہیں۔ ہندی کے حروف ٹ اور ڈ کا استعمال نہ کیا جائے۔ ہئیت اور جیالوجی (آراضیات) کے ترجمے کی بھی رائے دی۔ دوسرے خط میں سفارش کی کہ ایک عمدہ تاریخ مصر مسمی "حسن المحاضرہ" مصنفہ سیوطی ہے۔ "ہشت بہشت" کا نسخہ بھی بھیجا جو ادریس بدخشی کی تصنیف ہے جس میں شاہ مراد کی وفات ۸۵۵ ہجری تک کے حالات ہیں۔ مصنف کے بیٹے ابوالفضل الاختری نے اسے ۹۸۲ ہجری تک پہنچایا، لیکن یہ نسخہ اصل مصنف کا تھا جو ۸۵۵ ہجری تک ہے۔ انھوں نے ہیرن صاحب کی تاریخ کے ترجمے کی بھی رائے دی۔

خود سرسید نے دو کتابوں کی تالیف کا بیڑا اٹھایا۔ ایک تمام اردو مطبوعہ کتب نظم و نثر کی فہرست کی ترتیب بطور تاریخ زبان اردو۔ اس میں اموزدیل کی صراحت کی جائے گی۔

نام کتاب، نام مصنف معہ مختصر حال، زمانہ تصنیف، کچھ عبارت بطور نمونہ طرز بیان اور بعض مضامین کا خلاصہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

دوسرے اردو لغات جو سرسید نے لکھنی شروع کردی تھی۔ اس کا نمونہ موجود ہے جو آئندہ ہم اس رسالے میں پیش کریں گے اس پر بعض یورپین فاضلوں نے رائیں بھی لکھیں۔

یہ دونوں تجویزیں نہایت قابل قدر اور اردو زبان کے استحکام کے لیے لازم ہیں۔ سرسید کے صحیح ادبی ذوق اور دور بینی کا اسی ایک بات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ۶۶ برس پہلے اس چیز کا ڈول ڈالا تھا جس کی تکمیل پر ہم آج غور کر رہے ہیں۔

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جن میں سے بعض کے نام جو ہمیں معلوم ہوئے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

Marfat.com

۱- تاریخِ مصر قدیم مولفہ رولن
۲- تاریخِ یونان مولفہ رولن
۳- رسالہ علم فلاحت مولفہ اسکاٹ برلن
۴- تاریخِ چین بزبانِ فارسی قلمی، ترجمہ پادری ایکسوس
۵- تزک جہانگیری قلمی
۶- رسالہ علم انتظام مدن (پولیٹکل اکانمی) مولفہ ولیم سنیئر
۷- ایک گفتگو برعہد لارڈ ڈلہوزی ولارڈ کیننگ مترجم لفٹننٹ کرنل گریہم بزبان اردو-
۸- تاریخ ہند مولفہ الفنسٹن
۹- رسالہ علم آلات مولفہ ٹامسن
۱۰- رسالہ علم طبیعیات مولفہ ٹامسن
۱۱- رسالہ علم آب وہوا- مولفہ ٹامسن
۱۲- رسالہ برقی مولفہ ہیرس
۱۳- دیباچہ تاریخ فیروز شاہی
۱۴- ٹاڈ ہنٹر کی کتاب اقلیدس مترجمہ مولوی ذکاء اللہ
۱۵- جغرافیہ مولفہ پادری ولکنسن
۱۶- سیاست مدن (مل کی پولیٹکل اکانمی کا انتخاب) مترجمہ پنڈت دھرم نرائن رائے بہادر میر منشی اندور
۱۷- ترجمہ علم سیاحت مولفہ ٹاڈ ہنٹر-
۱۸- ترجمہ علم مثلث مولفہ ٹاڈ ہنٹر
۱۹- ترجمہ الجبرا، مبتدیوں کے لیے، مولفہ ٹاڈ ہنٹر
۲۰- ترجمہ نظریہ مساوات مولفہ ٹاڈ ہنٹر
۲۱- گال برتھ اور ہاٹن کی سائنٹفک مینول یوکلڈ کا ترجمہ
۲۲- گال برتھ اور ہاٹن کے سائنٹفک الجبرا کا ترجمہ
۲۳- برنارڈ سمتھ کی ارتھمیٹک کا ترجمہ
۲۴- برنارڈ سمتھ کے الجبرا کا ترجمہ

Marfat.com

۲۵- گال بریتھ کی کتاب حساب کا ترجمہ
۲۶- ٹاڈ ہنٹر کے الجبرا کا ترجمہ (کالجوں اور مدارس کے لیے)
۲۷- گال بریتھ کی Plain علم مثلث
۲۸- ٹاڈ ہنٹر کی Plain Co- Ordiate Geometry
۲۹- ٹاڈ ہنٹر کا Integral Calculus تکمیلی احصا
۳۰- ٹاڈ ہنٹر کا Differential Calculus تفریقی احصا
۳۱- ترجمہ تاریخ ایران مولفہ سر جان میلکم

دہلی کالج اور اس کی ورنی کلر ٹرانس لیشن سوسائٹی کے بعد یہ دوسرا ادارہ تھا جس نے انگریزی سے مختلف علوم و فنون کے ترجمے اردو زبان میں شائع کیے۔ یہ کام جب آج کل دشوار نظر آتا ہے تو اس وقت کتنا دشوار ہوگا جب نہ اچھے مترجم دستیاب ہوتے تھے اور نہ ان ترجموں کی قدر کرنے والے کچھ زیادہ تعداد میں تھے۔ علاوہ اس کے عجائب خانے کے لیے سکے بھی جمع کیے۔ چنانچہ مسٹر تھارن ہل جج سہارن پور اور مولوی فضل احمد تحصیل دار قائم گنج نے کچھ سکے بھیجے۔ ایک اشرفی عہد تغلق کی عنایت اللہ خاں صاحب رئیس بھیکم پور نے دی۔

سرسید کا قاعدہ تھا کہ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے تھے ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑجاتے تھے، چنانچہ سوسائٹی کی بہبودی اور ترقی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ضلع کے رئیسوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا، گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی، خود اپنی بساط سے بڑھ کر اس کو مالی امداد پہنچائی، اس کی عالی شان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی، اس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تدبیریں کیں، لائق لائق آدمی ترجمے کے کام کے لیے مقرر کیے، قریب چالیس کے چھوٹی بڑی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ غازی پور، علی گڑھ، بنارس، جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے برابر مدد پہنچاتے رہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی کی دُھن میں برابر لگے رہے۔ چنانچہ ولایت جاتے ہوئے جو خط انھوں نے مولوی مہدی علی خان کو عدن سے بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں "کہ مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج ہوا کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی کوشش کا واسطے

شکست کردینے سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کے سنبھالنے اور ممبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں"(۵)۔

محض سوسائٹی کی خاطر کلکتہ کا سفر اختیار کیا اور ۶ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو مذاکرۂ علمیہ میں ایک طویل لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پر دیا۔

اس سوسائٹی کے ذریعے سے بعض تعلیمی تحریکیں بھی کی گئیں۔ مثلاً تحصیلی مکاتب کے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس سوسائٹی کے ضمنی نتائج میں سے ورنی کلر یونی ورسٹی کی تحریک تھی جو اس زمانے کے لیے ایک عجیب خیال تھا۔ اس کا حال آئندہ ہم ایک علاحدہ مضمون میں لکھیں گے۔

اس سوسائٹی نے نہ صرف علمی اور تعلیمی خدمات انجام دیں بلکہ اس کی دیکھا دیکھی ملک کے مختلف مقامات میں متعدد انجمنیں اور سبھائیں قائم ہو گئیں جو اپنے اپنے حلقے میں مفید کام کرتی تھیں۔ سوسائٹی کے اخبار کا اردو اور دوسرے دیسی اخبارات پر بھی بہت اچھا اثر پڑا، اور وہ سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدگی سے بحث کرنے لگے۔ اس سوسائٹی اور "تہذیب الاخلاق" کا اردو زبان اور ادب پر بڑا احسان ہے۔

(اس مضمون کے لکھنے میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کی مختلف جلدوں، گریہم کی "لائف آف سید احمد خاں" اور "حیات جاوید" سے مدد لی گئی ہے۔)

## حواشی

(۱) "حیات جاوید"، حصہ اوّل، صفحہ ۱۲۱

(۲) فرانس کے گارساں دتاسی بھی سوسائٹی کے آنریری ممبر بنا دیے گئے۔

(۳) "حیات جاوید"، حصہ اوّل، صفحہ ۱۳۷

(۴) "حیات جاوید" حصہ دوم، صفحہ ۴۵

(۵) "حیات جاوید"، حصہ دوم، صفحہ ۴۶-۴۷

# ہماری باتیں ہی باتیں ہیں
# سیّد کام کرتے ہیں

(یہ قول سراسر حقیقت پر مبنی ہے۔ سرسید احمد خاں نے جب سے ہوش سنبھالا اس وقت سے لے کر مرتے دم تک کوئی ساعت ایسی نہیں گزری کہ وہ کام سے غافل رہے ہوں اور کام بھی ایسا وسیع اور ہمہ گیر جو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا۔ علمی، تعلیمی، معاشرتی، سیاسی، ادبی، لسانی غرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس پر انھوں نے گہری نظر نہ ڈالی ہو اور کڑی تنقید نہ کی ہو۔ ان کے کارنامے اس قدر عظیم الشان، حیرت انگیز اور مختلف نوعیتوں کے ہیں کہ ان کا تذکرہ ۱۵ منٹ کی مختصر تقریر میں کرنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کرنا ہے۔)

وہ ابھی اٹھارہ انیس برس کے تھے کہ ایسے کام میں لگ گئے جو قسام ازل نے پہلے سے ان کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔ جو آگے چل کر انھیں عمر بھر کرنا تھا۔ یعنی انھوں نے "سید الاخبار" مرتب کرنا شروع کر دیا جو ان کے بھائی نے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا تھا۔

قطع نظر بعض مذہبی، قانونی اور ریاضیات کے رسائل کے جو ابتدائی زمانے میں لکھے ان کی معرکتہ الارا تصنیف "آثار الصنادید" ہے جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو دلی کی عمارات پر کمال تحقیق، غیر معمولی، محنت و مشقت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ان کا دوسرا ابتدائی علمی کام "آئین اکبری" کی تصحیح و ترتیب ہے۔ علمی اعتبار سے یہ سرسید کا حیرت انگیز کام ہے۔ اسے جس انتہائی غور و فکر، کامل تحقیق و جستجو اور محنت اور سچے شوق سے انجام دیا وہ ایک صدی کے بعد اب بھی ہمارے ملک کا بڑے سے بڑا محقق اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ ان کتابوں کی ہمارے ملک میں تو قدر نہ ہوئی اور ہوئی تو فرانس اور انگلستان میں۔

تالیف و تصنیف کا یہ سلسلہ جاری رہتا تو وہ ایک اعلیٰ پائے کے مصنف اور

Marfat.com

محقق ہوتے، لیکن قدرت کو ان سے کچھ اور کام لینا تھا۔ یکایک مئی ۱۸۵۷ء میں ایک ایسا از غیبی گولہ آکر پھوٹا جس نے سارا نظام درہم برہم کردیا اور ملک میں ہولناک انقلاب برپا ہوگیا۔ اس میں مسلمان سب سے زیادہ خسارے میں رہے۔ ان پر آلام و مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ حکمراں قوم انھیں اس یورش کا بانی، اپنی حکومت کا باغی اور غدار سمجھتی تھی اور برادران وطن، نئی نئی قوت اور آزادی کے زعم میں اور کچھ نئے آقاؤں کی شہ پاکر انتقام پر کمر بستہ تھے۔ قوت پانے کے بعد مفتوح کا انتقام بڑا غضب ناک ہوتا ہے۔ ایسی دوزبردست قوتوں کا مقابلہ مسلمانوں کے بس کی بات نہ تھی ان پر افسردگی اور مایوسی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور دل چھوٹ گئے تھے۔ خود سید صاحب بھی جو اس شورش میں بہت سی آفات اور کھکھیڑیں اٹھا چکے تھے۔ اس عام مایوسی کا شکار ہوگئے اور تہیہ کرلیا کہ ہجرت کرکے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جابسیں۔ لیکن وہ جلد ہی سنبھل گئے اور قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر اپنی جان سلامت لے جانے کو نامردی اور بے مروتی پر محمول کیا اور یہ ارادہ ترک کردیا اور پھر قوم کی دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑے۔

باوجود سرکاری ملازم ہونے کے ملک و قوم کی خاطر جو سب سے بڑا کام اس وقت ان سے عمل میں آیا وہ "اسباب بغاوت ہند" کا تحریر کرنا تھا۔ اس میں سید نے مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی ہے اور گورنمنٹ پر جو الزام عائد ہوتے ہیں انھیں نہایت آزادی اور دلیری سے بیان کیا ہے اور اہل حکومت نے جو اسباب اپنے ذہن میں جاگزیں کررکھے تھے ان کی تردید کی ہے۔ ایسے زمانے میں جب آزادی کے نام پر زبان کٹتی ہو، حاکم کی زبان ہی قانون ہو، مارشل لا کا دور دورہ ہو، اور مسلمان ہونا بذات خود ایک جرم ہو، ایسی حیرت انگیز اخلاقی جرأت کا اظہار سید احمد خاں ہی کرسکتے تھے۔ اس پر انگریز حکام بہت برہم ہوئے اور بعض نے مصنف کو باغی اور قابل دار قرار دیا مگر یہ رسالہ انجام کار بغیر اثر کیے نہ رہا۔ یہ رسالہ اساس ہے بر عظیم ہندو پاک کی سیاست کا۔ مسٹر ہیوم بانی انڈین نیشنل کانگریس نے اعتراف کیا کہ "مجھ کو انڈین نیشنل کانگریس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" دیکھ کر پیدا ہوا۔

اس وقت سید مسلسل اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں سرگرم رہے ان

Marfat.com

بے گناہ مسلمانوں کو جو مجبوری اور دباؤ سے باغیوں کے ساتھ ہوگئے تھے یا جن کے خلاف ذاتی عناد یا سرکار میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے مخبریاں کی گئی تھیں ان کو بغاوت کے الزام سے بری کرایا اور ان کی جائدادیں واپس دلائیں۔ ایک رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" جاری کیا جس میں صحیح واقعات اور قطعی شہادتوں سے مسلمانوں کی خیر خواہی اور جاں نثاری ثابت کی۔ اہل یورپ اور انگریزوں کے دلوں میں قدیم سے مسلمانوں کے خلاف جو تعصب اور بدگمانیاں چلی آرہی تھیں انھیں رفع کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی۔ یہودی عیسائیوں کو حقارت سے ناصری کہتے تھے۔ اسلام میں انھیں نصاریٰ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ عیسائی اسے بھی حقارت کا لفظ سمجھتے تھے۔ سید صاحب نے اس لفظ کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھ کر اس بدگمانی کو رفع کیا۔ اسی طرح رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" تحریر کیا۔ جس میں آیات قرآنی، احادیث نبوی اور روایات فقہی سے اہل کتاب کے ساتھ کھانا کھانا جائز ثابت کیا "رسالہ ابطال غلامی" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اسلام نے دنیا میں سب سے پہلے غلامی کا قلع قمع کیا۔

یہ سب کچھ سید نے اس لیے کیا کہ مسلمانوں پر جو ہر طرف سے مختلف پیرایوں میں آفات کا نزول ہورہا تھا ان سے بچایا جائے۔ غرض جب کبھی اسلام یا مسلمانوں پر آنچ آئی تو سید سپر ہوگئے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "انڈین مسلمانز" شائع ہوئی جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں اور کسی حال میں گورنمنٹ کے خیر خواہ نہیں ہوسکتے اور وہابیت اور بغاوت دو مترادف لفظ ہیں، اس کا سید نے نہایت مدلل اور دندان شکن جواب دیا اور لکھا کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں۔

۱۸۶۴ء میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنا ڈالی۔ جس کا مقصد انگریزی سے علمی اور تاریخی کتابیں ترجمہ کرکے ملک میں روشن خیالی پھیلانا تھا اور کچھ دن بعد سوسائٹی کا اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" جاری ہوا۔ جس میں علمی، معاشرتی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ سیاسی مضامین اکثر سید صاحب خود لکھتے تھے۔

۱۸۶۶ء میں ورنی کلر (اردو) یونی ورسٹی کا منصوبہ گورنمنٹ میں پیش کیا جو گورنر جنرل اور وزیر ہند نے بہ نظر استحسان دیکھا مگر وہی فرسودہ اعتراض پیش کیے کہ دیسی

Marfat.com

زبانوں میں اس کی صلاحیت نہیں، کتابیں کہاں ہیں، پڑھانے والے کہاں سے میسر ہوں گے؟

اب سب سے بڑا مسئلہ ان کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کو پس ماندگی اور مذلت سے کیوں کر نکالا جائے۔ کامل غور و خوض اور اتنی مدت کے تجربے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک مسلمانوں میں جدید تعلیم نہ پھیلے گی ان کا پنپنا اور عزت سے رہنا ممکن نہیں۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے یہ نہایت ضروری سمجھا کہ وہ بذات خود انگلستان میں قیام کر کے وہاں کا طریقہ تعلیم دیکھیں اور پھر ہندوستان واپس آ کر اپنے حالات کی مناسبت سے اس کا ڈول ڈالیں۔ اس زمانے میں سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" شائع ہوئی، جسے پڑھ کر وہ بے تاب ہو گئے۔ اس میں اسلام کی حقانیت اور رسول کریم ﷺ کے کیریکٹر پر حملے اور اعتراض تھے۔ اس کے جواب کے لیے ہندوستان میں کتابوں اور نوشتوں کا کافی سامان نہ تھا۔ اس کے لیے بھی انگلستان جا کر رہنا ضروری تھا۔ مگر ان میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ لندن کا شاہی خرچ برداشت کر سکیں۔ اپنی کتابیں اور اثاث البیت بیچا، گھر اور کوٹھی رہن رکھی، دوستوں سے قرض لیا اور اللہ کا نام لے کر چل کھڑے ہوئے۔

قیام انگلستان میں سر ولیم میور کی کتاب کے جواب میں "خطبات الاحمدیہ" لکھی۔ یہ بڑی پائے کی کتاب ہے اور پہلی کتاب ہے، جس میں مخالفین کے اعتراضات کے جواب کمال تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔

انگلستان سے واپسی پر مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کے لیے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس میں مذہب، اخلاق و معاشرت وغیرہ پر ایسے مضامین لکھے گئے جن سے لوگوں میں ہل چل پیدا ہو گئی اور توہمات اور تعصبات پر کاری ضرب لگی اس کے بعد جب مدرسۃ العلوم قائم کرنے کی تجویز شائع کی اور مغربی علوم کی اہمیت پر زور دیا تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا اور انھیں کافر، ملحد، کرسٹان، لامذہب، دجال کے خطاب عطا ہوئے اور کفر کے فتوے دیے گئے مگر انھوں نے نہایت استقلال سے اپنا کام جاری رکھا اور مدرسۃ العلوم قائم کر کے چھوڑا۔ یہ تعلیم گاہ ہی نہ تھی تربیت گاہ بھی تھی۔ جہاں کتابی درس کے ساتھ انسان گری کا بھی سبق دیا جاتا تھا۔ آخر کار یہ روشن خیالی اور قومیت کا سرچشمہ اور مسلمانوں کی علمی، سیاسی، تہذیبی، معاشرتی تحریکوں کا

Marfat.com

مرکز بن گیا اور یہی کالج کے بعد میں مسلم یونی ورسٹی کے درجے کو پہنچ گیا۔ اس کالج کی تائید اور مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لیے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔

سیاست میں بھی سرسید کا کارنامہ کچھ کم اہم نہیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ بس اس سے اندازہ کرلیجیے کہ وہ مسلمان اکابر جو انڈین نیشنل کانگریس کے شیدائی اور ستون تھے اور جنھیں بارہا کانگریس کی صدارت کی عزت بخشی گئی آخر بیزار ہو کر ایک ایک کر کے الگ ہوگئے اور اس کے خلاف وہی باتیں اور دلیلیں بیان فرمانے لگے جو کبھی سرسید نے بیان کی تھیں اور جن کی بدولت وہ مورد لعن و طعن ہوئے تھے۔

من جملہ بے شمار احسانات کے جو سرسید نے ہماری قوم پر کیے ان کا بہت بڑا احسان اردو زبان پر ہے۔ انھوں نے زبان کو پستی سے نکالا انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا۔ جدید علوم کے ترجمے کرائے اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا اور جب کبھی اردو پر آنچ آئی سینہ سپر ہوگئے۔

جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے اردو کو خارج کرنے اور اس کے بجائے ہندی بھاشا رائج کرنے کی کوشش اور سرکار میں محضر بھیجے تو سرسید کو سخت رنج اور صدمہ ہوا۔ لکھتے ہیں "اب تک میں نے جتنے کام کیے وہ ملک کی ترقی اور تمام باشندگان ہند کی فلاح و بہبود کے لیے تھے لیکن جب سے ہندوؤں نے اردو زبان کو مٹانے کی کوشش کی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہم مل کر کام نہیں کرسکتے"۔

اس وقت سے محض اردو کی مخالفت کی وجہ سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قوم ہوگئے اور دو قومی نظریے کی بنیاد پڑی جو پاکستان کی بنا کا باعث ہوا اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ قصر پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیر مرد کے مبارک ہاتھوں نے رکھی اور وہ اینٹ اردو زبان تھی اور یہی اب پاکستان کی وحدت و سالمیت کے قیام و استحکام کی ضامن ہے۔

---

(یہ تقریر ۲۷ مارچ ۱۹۵۵ء کو ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر کی گئی)

Marfat.com

# سر سید احمد خاں مرحوم کی

## مجوزہ اردو لغات کا نمونہ

یوں تو سر سید مرحوم کا اردو زبان اور ادب پر بہت بڑا احسان ہے لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں خالص اردو ادب کی خدمت کا بھی تہیہ کیا تھا۔ اس ضمن میں اُن کے پیش نظر دو چیزیں تھیں۔ ایک "اردو لٹریچر کی تاریخ یا فہرست جس میں تمام کتابوں کا" جو ابتدا سے آج تک چھپی ہیں، نام، اُس کے مصنف کا حال، تصنیف کا زمانہ، طرزِ بیان اور مختلف مقامات سے اُس کی عبارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہوگا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ دوسری اردو لغات۔ اس کے چند ورق انھوں نے بطور نمونے کے لکھے تھے جو اُس وقت علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوگئے تھے۔ چنانچہ سوسائٹی کی طرف سے ۹ مئی سنہ ۱۸۶۸ء کو جو اڈریس سر ولیم میور لیفٹننٹ گورنر صوبہ جات شمال مغرب کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اُس میں یہ بھی تھا کہ منجملہ اُن کتابوں کے جو اردو زبان میں سوسائٹی تیار کر رہی ہے یہ دو کتابیں بھی ہیں جو سوسائٹی کے لائف آنریری سکریٹری سید احمد خاں تیار کر رہے ہیں۔

سید صاحب مرحوم کو اپنی زبان سے بڑی محبت تھی۔ یہی نہیں کہ اُن کی تصانیف و تالیفات، جن کی تعداد بہت کثیر ہے اس زبان میں ہیں بلکہ ادبی اور علمی مضامین کو فصاحت اور سلاست سے ادا کرنے کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہے اور جب کبھی اردو پر آنچ آئی تو وہ فوراً اس کی حمایت کے لیے کمر بستہ ہوگئے۔

سر سید کی دور اندیشی اور ادبی ذوق قابل داد ہے کہ انھوں نے ۶۸ برس پہلے اردو ادب، کی تاریخ اور اردو لغات مرتب کرنے کا خیال کیا۔ ہر زبان کے لیے جو ادبی ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے مستند اور جامع لغات کا ہونا لازم ہے۔ اس نمونے سے جو یہاں درج کیا جاتا ہے معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس انداز پر اس لغات کا ترتیب دینا تجویز کیا تھا۔

Marfat.com

ہر لفظ کے متعلق یہ بتایا ہے کہ وہ اسم ہے یا صفت، ضمیر ہے یا فعل، ظرف زمان ہے یا ظرف مکان، مونث ہے یا مذکر۔ ہر لفظ کے مختلف معنی اور ان کے فروق بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ فعل ہے تو یہ بھی بتادیا ہے کہ لازم ہے یا متعدی اور متعدی ہے تو بیک مفعول یا بدو مفعول۔ لفظ سے جو محاورے بنے ہیں وہ بھی تشریح اور حسب موقع سند کے ساتھ بیان کردیے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے جو ہماری متداولہ لغات میں نہیں پائی جاتی کہ لفظ کی تعریف و تشریح بھی کردی ہے۔ ورنہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اہل لغت مترادفات لکھ دیتے ہیں اور تعریف سے گریز کرجاتے ہیں۔ البتہ ایک کمی ضرور پائی جاتی ہے کہ لفظ کے اشتقاق اور اصل سے بحث نہیں کی گئی۔ یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے، اصل زبان میں اس کی کیا صورت تھی اور کیا مفہوم تھا اور اردو میں آکر اس کی صورت اور مفہوم میں کیا تغیر ہوا۔ یہ ایسا مشکل اور تحقیق کا کام ہے کہ اس زمانے میں بھی لغت کی جو کتابیں تالیف ہوئی ہیں وہ بھی اس سے عاری ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک شخص کا نام نہیں اس کے لیے ایک جماعت کی متحدہ کوشش درکار ہے۔

الفاظ کے اختصار کے لیے جو حروف مفرد معین کیے گئے ہیں ان کی تشریح

| | |
|---|---|
| اسم: س | لفظ خطاب: ل خ |
| مذکر: م | ضمیر متکلم: ض م |
| مونث: ث | ضمیر حاضر: ض ح |
| مصدر: صد | ضمیر غائب: ض غ |
| لازمی: لا | ضمہ اور کسرہ اور واؤ اور یائے معروف — ف |
| متعدی: مت | |
| متعدی ایک مفعول سے زائد۔ مت مت | ضمہ اور کسرہ اور واؤ اور یائے مجہول — ل |
| صفت: ص | ظرف زمان: ظ ز |
| مفرد: د | ظرف مکان: ظ م |
| جمع: ج | |

# سرسید کی مجوزہ اردو لغات

## الف

الف: س، م
پہلا حرف حروف تہجی کا۔ بمعنی نفی مثلاً اکارت، یعنی بیکار، الونا، بے نمک۔ فال (۱)، عدم قحط۔ مگر پچھلے دونوں لفظ بہت کم بولے جاتے ہیں۔

آب: س، م۔
پانی، یعنی ایک رقیق سیال، جسم جو بادلوں سے برستا ہے اور دریاؤں اور چشموں اور سوتوں میں اکٹھا ہوتا ہے۔

آب دار: س، م
آب دارنی: س، ث
وہ شخص یا وہ عورت جس کے ذمہ پینے کے پانی کا انتظام ہو۔

آب دار خانہ: س، م۔
وہ مکان جس میں آب دار پانی رکھتا ہے۔

آب خورہ: س، م۔
ایک خاص صورت کا چھوٹے منہ کا مٹی کا برتن جس سے پانی پیا جاتا ہے اگر اسی صورت کا برتن اور کسی چیز کا ہو تو اس چیز کا نام لینا چاہیے، مثلاً تانبے کا آب خورہ، پیتل کا آب خورہ، چاندی کا آب خورہ۔

آب حیات: س، م۔
۱۔ وہ پانی جس کا ذکر کہانیوں میں ہے کہ جس کے پینے کے بعد موت نہیں آتی۔
۲۔ بادشاہوں اور امیروں کے پینے کے پانی کا نام جو نیک فال سمجھ کر لیا جاتا ہے۔

آب خاصہ: س، م۔
خاص بادشاہوں اور امیروں کے پینے کا پانی۔

آب حیوان: س، م۔
آب حیات۔
"جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر تو ہرگز
نہ پیتا آب حیواں ڈوب مرتا آبِ حیواں میں"
(ذوق)

Marfat.com

آب شور: س، م۔
۱۔ سمندر ۲۔ کھاری پانی۔

آب شورہ: س، م۔
۱۔ مٹھاس گھول کر لیموں نچوڑا ہوا پانی۔
۲۔ شورہ کا ٹھنڈا کیا ہوا پانی۔

آب بقا: س، م۔
۱۔ آبِ حیوان
کہانیاں ہیں حکایاتِ خضر و آبِ بقا
بقا کا ذکر ہی کیا اس جہانِ فانی میں
(ذوق)
۲۔ حیات ابدی جو دوسری زندگی میں ہوتی ہے۔

آب پاشی: س، م۔
باغ میں اور کھیتوں میں کنوے سے یا نہر یا تالاب سے پانی دینا۔

آبی: ص۔
۱۔ جو چیز پانی سے علاقہ رکھے ۲۔ پانی کے رنگ کے مانند، یعنی ہلکا نیلا رنگ۔

آبی روٹی: س، ث۔
ایک قسم کی خمیری تنوری روٹی جس میں صرف پانی پڑا ہو، دودھ اور گھی نہ پڑا ہو۔

آب: س، ث۔
۱۔ صفائی اور براقی۔ مثلاً موتی کی آب۔
۲۔ رونق و چمک مثلاً کپڑے کی آب۔ کھانے کی آب۔
۳۔ کاٹنے والے ہتھیار کے لوہے کی چمک اور سختی اور تیزی مثلاً تلوار کی آب۔

آب دار: ص۔
۱۔ رونق دار مثلاً آب دار سالن، آب دار کپڑا ۲۔ صاف اور براق مثلاً آب دار موتی۔ ۳۔ سخت اور تیز مثلاً آب دار تلوار۔

آب داری: س، ث۔
بمعنی آب، موتی کی، کپڑے کی، کھانے کی، تلوار کی آبداری۔

آب کار: س۔ م۔
کلال یعنی شراب بنانے یا بیچنے والا۔

آب کاری: س، ث۔
شراب یا اور نشے کی چیزوں کے بیچنے یا بنانے کا پیشہ۔

آباد: س۔
۱۔ بسا ہوا، دِلّی آباد ہے یعنی بسی ہوئی ہے، شہر آباد ہے یعنی بسا ہوا ہے، گھر آباد ہے یعنی بسا ہوا ہے اور اس میں لوگ رہتے ہیں۔

Marfat.com

بستے ہیں تیرے سایہ میں سب شیخ و برہمن
آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

(درد)

۲- بسایا ہوا، جب کہ فاعل سے مرکب ہو مثلاً شاہجہاں آباد، یعنی شاہجہاں کا بسایا ہوا۔ ۳- دعائیہ مثلاً آباد رہو یعنی مال و دولت گھر بار اولاد سے بھرپور رہو، خانہ آباد، دولت زیادہ۔

آبادی: س، ث۔

۱- بستی یعنی وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہو کر رہتے ہیں۔

ج: آبادیاں، آبادیوں۔

۲- فعل ایک جگہ رہنے کا مثلاً دِلی میں آبادی ہوتی جاتی ہے۔

آباد ہونا: صد، لا۔

بسنا یعنی ایک جگہ جمع ہو کر رہنا۔

آباد کرنا: مت: بسانا، آباد کروانا۔

مت مت:

بسوانا، گھر کا آباد ہونا، لوگوں کا اس میں رہنا، دل کا آباد ہونا، طمانیت سے ہونا، باغ کا آباد ہونا، سرسبز و شاداب ہونا۔ مسجد کا آباد ہونا، آراستہ رہنا اور کثرت سے نمازیوں کا نماز پڑھنے کو آنا۔

آب تاب: س، ث۔

رونق، شان و شوکت، محسوس چیزوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً نہایت آب تاب سے فوج آراستہ ہے، غیر محسوس پر بھی بولا جاتا ہے مثلاً نہایت آب تاب کی گفتگو کی۔

آبرو: س، ث۔

عزت، حرمت یعنی ادب اور تعظیم کے مستحق ہونے کا خیال۔

آبرو ریزی: س، ث۔

بے عزت کرنا، یعنی وہ فعل جو ادب اور تعظیم کے استحقاق کے برخلاف ہو۔

آبائی: ص۔

موروثی، باپ دادا سے پہنچی ہوئی، مگر بہت کم بولا جاتا ہے۔

آبگینہ: س، م۔

شیشہ، کاچ کا ظرف جو ایک خاص صورت پر نہایت باریک بنایا گیا ہوتا ہے پیٹ بڑا اور چپٹا اور گردن پتلی، گفتگو میں کبھی یہ لفظ نہیں بولا جاتا صرف اشعار میں آتا ہے۔

آبلہ: س، م۔
پھپولا، آدمی کے بدن پر جو گول برجی دار دانہ اٹھ آتا ہے اور جس میں صوف سفید پانی سا بھرا ہوتا ہے۔

ج: آبلے۔ جب کہ فعل لازمی کے ساتھ ہو مثلاً آبلے پڑگئے، آبلوں جبکہ مضاف ہو یا فعل متعدی کے ساتھ مثلاً آبلوں کا پھوٹنا۔

"اہلِ تدبیر کی واماندگیاں آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں"
(غالب)

آبنوس: س، م۔
ایک قسم کا درخت جس کی لکڑی نہایت سیاہ اور وزنی ہوتی ہے۔

آبنائے: س، ث۔
پانی کا گلیارہ یعنی پانی کا کم عرض رستہ جس سے ایک بڑا سمندر دوسرے بڑے سمندر سے مل جائے۔

آب نے: س، ث۔
حقے کی نے جو پانی میں کھڑی رہتی ہے۔

آبدست: س، ث۔
پیخانہ پھرنے کے بعد پانی سے دھونا۔

آپ: ل، خ۔

۱۔ اگر مخاطب بزرگ اور قابل تعظیم و ادب ہو تو اس لفظ سے خطاب کیا جاتا ہے۔

بے نیازی حد سے گزرے بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمادیں گے کیا
(غالب)

۲۔ اسی لفظ سے مساوی درجہ کے مخاطب کو بلکہ اپنے سے کم درجہ کے مخاطب کو بھی خطاب کیا جاتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ جب مخاطب بزرگ اور قابل ادب ہے تو اس کے ساتھ تعظیم کے اور لفظ بھی بولے جاتے ہیں اور مساوی درجہ اور کم درجہ کے مخاطب کے ساتھ وہ لفظ نہیں بولے جاتے مثلاً آپ جو فرمادیں وہی ٹھیک ہے، آپ جو کہیں وہی ٹھیک ہے۔ مساوی درجہ کے ایسے شخصوں میں جن میں دوستی اور ارتباط کم ہے اکثر اسی لفظ سے خطاب کیا جاتا ہے۔ ۳۔ کبھی کم درجہ کے ایسے مخاطب کو جو اس خطاب کے لائق نہیں ہے بطور طنز کے اس لفظ سے خطاب کرتے ہیں۔ کبھی اس خطاب کے لائق مخاطب کو طنزاً اس سے خطاب کیا

Marfat.com

جاتا ہے اور الفاظ مابعد اور لہجہ تلفظ
اس پر دلالت کرتا ہے مثلاً آپ
بھی خوب ہیں۔

آپ: س۔
بمعنی خود۔ بجا ے ذات اور نفس
کے بولا جاتا ہے اور
تاکید کا فائدہ دیتا ہے مثلاً میں
آپ جاؤں گا، وہ آپ گیا تھا، تم
آپ جاؤ۔

آپ ہی آپ:
آپ سے آپ:
خود بخود یعنی اپنی ہی ذات سے بغیر
دوسرے سبب کے مثلاً آپ ہی
آپ خفا ہوتے ہو، خدا آپ ہی
آپ موجود ہے، یہ کام آپ سے
آپ ہوجائے گا۔

آپ میں آنا: ص۔
ہوش میں آنا۔

آپ میں نہ ہونا: ص۔
ہوش میں نہ ہونا۔
ہم تا سحر آپ میں نہیں تھے
کیا جانے رہے وہ کس کے گھر رات
(مومن)

آپ ہیں:
حقیقت میں خطاب ہے مگر خاص
ایسی حالت میں بولا جاتا
ہے جب کہ کسی پرانے دوست کو
دفعتاً دیکھیں یا شبہ میں پڑنے کے
بعد پہچانیں۔
دیکھ صحرا میں مجھے اول تو گھبرایا تھا قیس
پھر جو پہچانا تو بولا حضرتِ من آپ ہیں
(ظفر)

آپا: س۔
بمعنی ذات، نفس، مثلاً ایسا خفا
ہوا کہ آپ (۲) ہی سے
نکل پڑا۔
اتنا بڑھ بڑھ کے بات مت کیجے
اپنا آپا سنبھالیے حضرت
(آہی)

آپا دھاپی: س، ث۔
اپنے اپنے کام میں یا اپنی اپنی فکر
میں بے تحاشا مصروف ہونا اور
دوسروں کی سُدہ نہ لینا۔

آپا: س، ث۔
بڑی بہن۔

آپس: س۔
۱۔ چند شخصوں میں کسی خاص قسم
کا علاقہ ہونا برادری کا،
رشتہ داری کا، محبت کا، پیشہ کا،
مذہب کا، کسی ایک رائے اور
ایک خیال کے ہونے کا۔ ۲۔
بمعنی ایک دوسرے کے جب کہ لفظ

Marfat.com

میں کے ساتھ مرکب ہو۔

کھے ہے چھیڑنے کو میرے گر ہوں میرے بس میں
نہ دوں ملنے کسی معشوق اور عاشق کو آپس میں
(مومن)

آپس داری:

بمعنی رشتہ داری، برادری۔

آتو: ف، س، ث۔

وہ عورت جو لڑکیوں کو پڑھاتی ہے۔

آٹا: س، م۔

پسے ہوئے گیہوں اور اگر کوئی اور اناج پسا ہوا ہو تو اُس کا نام بھی لیا جائے گا مثلاً جو کا آٹا، چاولوں کا آٹا۔

آٹھ: س، م۔

اکائیوں میں کے ایک عدد کا نام ہے جو چار کا دو گنا اور دو کا چوگنا ہوتا ہے اور جو صحیح عدد سات کے بعد آتا ہے۔

آٹھ: ص۔

جب کہ اپنے معدود کے ساتھ مرکب ہو اور اس کی تعداد بتائے مثلاً آٹھ مرد، آٹھ عورتیں، آٹھ روپے۔

آٹھواں: ص، م۔
آٹھویں: ف، ص، ش۔

(۱) اس معدود کی جس سے یہ عدد پورا ہوتا ہے اور جو سات کے بعد آتا ہے مثلاً آٹھواں گھوڑا جو سات گھوڑوں کے بعد ہے۔

۲- درجہ، مرتبہ، خواہ باعتبار ترقی کے ہو خواہ باعتبار تنزل کے مثلاً فلاں شخص امتحان میں آٹھواں رہا۔

آٹھویں: ل، ص، م۔

بمعنی آٹھواں جب کہ اپنے موصوف کے ساتھ ہو مثلاً آٹھویں دن آنا، آٹھویں درجہ پر منتخب ہوا۔

آٹھوں: ص۔

آٹھ کے ہر ایک معدود کا کسی صفت میں شامل ہونا مثلاً آٹھوں نے مارا یعنی ہر شخص ان آٹھ میں کا مارنے میں شریک تھا۔

آٹھواں حصہ: س، م۔

کسی چیز کا ایک حصہ جب کہ اس کو آٹھ برابر حصوں میں تقسیم کیا ہو، ایک کو جو آٹھ پر تقسیم کیا جائے اس کا خارج قسمت۔

آٹھ آٹھ آنسو رونا: صد، لا۔

بہت رونا۔

آٹھ آٹھ آنسو رولوانا: صد، مت۔

۱- بہت سا رولوانا۔

Marfat.com

۲- ایسی تکلیف اور رنج پہنچانا جو بہت سے رونے کا باعث ہو۔

**آٹھوں گانٹھ کمیت:** ص۔

ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مطلب میں نہایت ہوشیار ہو اور جس طرح بنے اپنا مطلب نکال لے اور اس کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

**آثار:** س، م، ج۔

نشانیاں، علامتیں۔

**آثار:** س، م، د۔

بنیاد کا یا دیوار کا عرض۔

**آج:** س، م، د۔

وہ دن جو کہ موجود ہے۔

محتسب آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
کون سا دل ہے کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا
(درد)

**آج کل کرنا:**
**آج کل بتانا:** صد، لا۔

امروز فردا کرنا یعنی کسی وعدہ کے پورا کرنے کو ٹالنا۔

**آج کل:** ظ، ز۔

۱- قریب زمانہ گزرا ہوا یا آیندہ، جب کہ اس لفظ کا ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو ان دونوں لفظوں میں واؤ کبھی نہیں آتا۔ ۲- جلدی، یعنی تھوڑے دن اور بحذف حرف عطف یا حرف تردید کے بمعنی آج اور کل کے بولنا غلط ہے۔

**آحاد:** س، م، ج۔

بمعنی اکائیاں، دس سے کم صحیح عددوں کا نام۔

**آخر:** س، م، د۔

وہ جو سب کے بعد ہو خواہ زمانہ میں اور خواہ ترتیب میں اور معقول ہو یا محسوس۔

**آخرش:**
**آخر کار:** س، م، د۔

بمعنی آخر مگر اس کا استعمال صرف معقولات پر ہے۔

**آخری وقت:** س، م، د۔

وہ وقت کہ جب موت بہت قریب ہو۔

**آخرت:** س، ث، د۔

قیامت یعنی وہ دن جو اس دنیا کے فنا ہونے کے بعد ہوگا اور جس میں لوگوں سے ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔

**آخور:** س، ث، د۔

وہ کوڑا کرکٹ اور ناقص گھاس جو گھوڑوں کے آگاڑی، پچھاڑی میں جمع ہو جاتی ہے۔

**آخور کی بھرتی:** س، ث، د۔

ہر چیز جو ناقص اور ناکارہ ہو۔

آداب: س، م، ج۔

۱- وہ طریقہ جس سے دو سروں کی بڑائی ظاہر کی جاتی ہے۔

۲- کسی کام کے کرنے کے طریقے جیسے نماز کے آداب، کھانے کے آداب۔

آداب: س، م، د۔

۱- ہر بات کو سلیقہ سے اور اچھی طرح کرنا۔

میں نہ تڑپا جو دم ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا مدِ نظر عشق کا آداب مجھے
(ذوق)

۲- وہ فعل جو کسی بڑے کو دیکھتے ہی کیا جاتا ہے جیسے سلام یا مجرا اور جب کہ کسی بڑے کے سامنے زبان سے یہ لفظ کہا جاتا ہے تو گویا اُس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ میں آپ کی تعظیم ادا کرتا ہوں اور بجائے سلام کے بھی مستعمل ہوتا ہے۔

آداب بجالانا: صد، لا۔

یعنی وہ فعل کرنا جس سے اس شخص کی جو مستحق تعظیم کا ہے تعظیم ادا ہوتی ہے، مغلیہ سلطنت میں جب بادشاہ کے سامنے کوئی حاضر ہوتا تھا تو چوبدار نہایت خوش آوازی سے پکارتا تھا آداب بجالاؤ جہاں پناہ بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت۔ پہلے جملے سے یہ مراد ہے کہ وہ فعل کرو جس سے تعظیم ادا ہوتی ہے اور باقی جملے دعائیہ ہیں۔

آدم: س، م، د۔

اس انسان کا نام ہے جو سب سے اول پیدا ہوا اور جس کی ہم سب اولاد ہیں۔

آدم زاد: س، م، د۔

بمعنی انسان۔

آدمی: س۔ م۔ د۔

بمعنی انسان یعنی آدم کی اولاد۔

ج: آدمی۔

فعل لازمی کے ساتھ۔

ج: آدمیوں

فعل متعدی کے ساتھ مثلاً دس آدمی آئے، دس آدمیوں نے مارا۔

آدمیت: ص، ث، د۔

وہ نیک اخلاق اور عادات جو انسان میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہونے کے سبب سے اس میں ہونے چاہئیں۔

آدھا: ص، م۔
آدھی: ص، ث۔

Marfat.com

دو برابر حصوں میں کا ایک مثلاً آدھا دن، آدھی رات، آدھا کپڑا، آدھی روٹی اور حالت ترکیب میں پہلے الف کی مد اور آخر کا الف بولا نہیں جاتا جیسے کہ ادہ کچرا۔

آدھوں آدہ: ص۔
برابر کے دو حصے۔

آدھا سیسی: س، م۔
سر کا ایک مرض ہے جس کے سبب سے آدھے سر میں درد ہوتا ہے جس کو دردِ شقیقہ کہتے ہیں۔

آر: س، م، د۔ آریں۔
ج: بیلوں کے ہانکنے کا ایک آلہ ہے جو ایک پتلی گول لکڑی یا چھڑی میں لوہے کی نوک کاٹنے کی صورت کی لگا لیتے ہیں اور چلنے کے لیے بیل کے پٹھے میں یا دم کے پاس چبھوتے ہیں۔

آراستگی: ] صد، لا۔
آراستہ ہونا: ]
کسی چیز کا اپنے ضروری لوازمات سے مہیا ہونا۔

آراستہ: ص۔
کوئی چیز جو اپنے ضروری لوازمات سے مرتب ہو، گھوڑا، باغ، مکان، آراستہ ہے۔

آراستہ کرنا: صد، مت۔
کسی چیز کے ضروری لوازمات کا مہیا کرنا، مکان کو، باغ کو، گھوڑے کو دل کو آراستہ کرو۔

آرام: س، م، د۔
ایسی حالت جس میں کچھ تکلیف روحانی یا جسمانی نہ ہو۔

عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے
(آفتاب)

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو
(میر)

۲۔ نیند، آرام میں ہیں یعنی سوتے ہیں۔

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
(میر)

۳۔ بیماری سے اچھے ہونے کی یا اس میں تخفیف ہونے کی حالت، اب تو آرام ہے یعنی بیماری میں تخفیف ہے، اب آرام ہے یعنی صحت ہے۔

آرام گاہ: س، م، د۔
امیروں کے سونے کی جگہ۔

آرایش: س، ث۔
۱۔ کسی چیز کے اپنے ضروری لوازمات سے آراستہ ہونے کی حالت۔ ۲۔ اسباب اور سامانِ آرایش۔ ۳۔ کاغذ کے پھولوں کے تختے اور پہاڑ اور چمن اور درخت اور روشنی کے کنول وغیرہ جو ساچق اور برات میں ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

آرزو: س، ث۔
دل کی خواہش کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کی جس کا ہونا یا نہ ہونا مشکل ہو یا اختیار میں نہ ہو۔
ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں
(درد)

آرزو کرنا: صد، لا۔
آرزو کروانا: صد، مت۔
کسی چیز کی خواہش کرنا یا خواہش کروانا۔

آرسی: س، ث، د۔ آرسیاں۔
ج: بحالت مبتدا ہونے یا موصوف ہونے کے۔
آرسیوں: ج۔

اضافت کی حالت میں۔ کاچ کا بنا ہوا گول یا مستطیل چھوٹا سا پرکالہ جس میں منہ دیکھتے ہیں اور جس کے ایک طرف پارہ کی قلعی ہوتی ہے اور جس کو کسی چیز کے چوکھٹے میں جڑ دیتے ہیں اور گول پرکالہ کو اس طرح چاندی یا سونے میں لگاتے ہیں کہ ہاتھ کے انگوٹھے میں بطور انگوٹھی کے پہنا جائے۔

آرسی مصحف: س، م۔
ہندوستان کے مسلمانوں کی بیوقوفی کی ایک رسم ہے کہ جب نکاح ہو چکتا ہے اور دُلہا اس مکان میں جاتا ہے جہاں دُلہن کے سر پر ایک لال کپڑا ڈال کر اور دونوں کے سر ملا کر ان کے سامنے قرآن میں سے سورۂ اخلاص کھول کر رکھتے ہیں اور ایک آرسی رکھتے ہیں تاکہ دُلہا اور دُلہن اوّل سورۂ اخلاص کو ایک ساتھ دیکھیں اور پھر اسی وقت ایک ساتھ آئنہ میں دُلہا اور دُلہن اپنی اپنی شبیہہ دیکھیں۔

---

(۱) اکال کے معنی ہندی میں قحط کے ہیں۔ اس سے بگڑ کر اردو میں کال ہو گیا ہے لیکن اکال کے معنی عدم قحط کے نہیں آتے
(۲) کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے "آپے ہونا چاہیے"

Marfat.com

# مصلحِ اعظم سر سید احمد خاں

سر سید احمد خاں اُن خاص بندگانِ خدا میں سے ہیں جنھوں نے خلق خدا یا اپنی قوم یا وطن کی سچی اور بے لوث خدمت کی اور ذلت و زوال اور تباہی سے نکال کر ترقی کے رستے پر لگایا۔

سید احمد خاں دلّی کے رہنے والے تھے اور ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں شاہ جہاں کے عہد میں آئے اور اس وقت سے آخر تک ان کے خاندان کا تعلق مغلیہ سلطنت اور مغلیہ بادشاہوں سے رہا۔

سید احمد خاں کے والد میر تقی ایک آزاد منش شخص تھے۔ اس لیے بچپن میں سید صاحب کی ابتدائی تعلیم اور تربیت کی تمام نگرانی ان کی والدہ نے کی۔ ان کی والدہ اگرچہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر وہ بڑی منتظم نیک دل اور روشن خیال بی بی تھیں۔ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ غریبوں اور بے کس عورتوں کی مدد میں صرف کرتیں۔ نوکروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتیں۔ تعویذ، گنڈے اور توہمات پر اعتماد نہیں رکھتی تھیں۔ سر سید کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ انھیں ایسی پاک نفس اور دانش مند ماں کی تربیت حاصل ہوئی جس کا ان کے اخلاق اور کردار پر بہت اثر پڑا اور یہ اثر آخر زندگی تک رہا۔

والدہ سے انھوں نے صرف قرآن مجید اور فارسی کی دو چار ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد دوسرے اساتذہ سے فارسی اور عربی کی تحصیل کی۔ سر سید کے نانا دبیر الدولہ امیر الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں صاحب علم و فضل اور علوم ریاضیات کے بڑے ماہر تھے اور ان کے ماموں نواب زین العابدین خان کو بھی فنون ریاضی میں بڑا دخل تھا۔ ریاضی کی کتابیں اور آلاتِ رسد اور اعمال اصطرلاب وغیرہ متعدد رسالے ان سے پڑھے اور اپنے نانا کے بعض رسالوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ جب

Marfat.com

انھوں نے پڑھنا چھوڑا تو ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد خود ہی مطالعہ کرتے رہے اور اس وقت کے باکمال اساتذہ اور اہل علم مثلاً مرزا غالب، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مولانا صہبائی وغیرہ کی صحبت نصیب ہوئی۔ جس میں علم و ادب اور شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ ملازمت کے بعد انھوں نے اپنا علم پھر تازہ کیا اور بعض نامور اساتذہ سے عربی ادب اور حدیث کی سند حاصل کی۔

جب سر سید کی والدہ کا انتقال ہوا تو ان کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی۔ قلعے کی آمدنی میں سے کچھ تو ان کی والدہ کے نام جاری رہا، باقی سب تنخواہیں بند ہو گئیں اس لیے اب انھیں مجبوراً سرکار انگریزی کی ملازمت کا خیال ہوا۔ چند مہینے کام سیکھنے کے بعد وہ عدالت کے سر رشتہ دار ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے قوانین دیوانی کا خلاصہ تیار کیا۔ جس کے صلے میں ان کے لیے منصفی کی سفارش کی گئی۔ امتحان منصفی میں بھی کامیاب ہو گئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد منصفی کے عہدے پر مقرر کر دیے گئے۔ اس زمانے میں جب وہ دلی میں منصف تھے بادشاہ نے انھیں جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا خطاب عطا فرمایا۔

تالیف و تصنیف کا انھیں بہت شوق تھا۔ پہلے تو بعض قانونی کتابیں تصنیف کیں۔ پھر کئی مذہبی رسالے لکھے اور ایک عربی رسالے کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ دلی میں جب وہ منصف تھے انھوں نے ایک ایسا اچھا کام کیا جو علمی دنیا میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ ان کی معرکتہ الارا تصنیف "آثار الصنادید" ہے جو پہلی بار ۱۸۴۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر تیس برس کی تھی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو دہلی کی عمارات پر کمال تحقیق اور غیر معمولی محنت اور صحت سے لکھی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے زمانے میں اور ایسی صحبتوں میں جب کہ ہمارے ادب کا رنگ کچھ اور ہی تھا اور شعر و سخن اور مذہبی تعلیم کے سوا دوسری جانب مطلق توجہ نہ تھی، انھیں اس قسم کی تحقیقات کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ اس کی تالیف میں جو محنت و مشقت انھوں نے اٹھائی وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ان کا دوسرا ابتدائی علمی کارنامہ "آئین اکبری" کی تصحیح و تدوین ہے۔ "آئین اکبری" اپنی نوعیت کی بے نظیر کتاب ہے جو اس زمانے کی ہر قسم کی معلومات کا بے بہا خزانہ ہے۔ اس کی زبان اور طرز بیان بھی نرالا ہے پھر اس میں مختلف قسم کی معلومات جن کا سلطنت اور حیات انسانی سے کچھ بھی تعلق ہے،

Marfat.com

ایسی جمع کردی ہیں کہ ان کا صحیح طور پر سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ ایسی کتاب کی تصحیح وترتیب آسان نہ تھی۔ اس میں انھوں نے تحقیق و تلاش کی پوری داد دی ہے۔ یہی نہیں کہ متعدد نسخے جمع کرکے تصحیح کی ہو بلکہ اصل کتاب میں جو خامیاں تھیں انھیں رفع کیا اور جو کمیاں تھیں انھیں پورا کیا اور جو فروگزاشتیں تھیں ان کی اصلاح کی اور اپنی طرف سے بہت سے مفید اضافے کیے۔ سرسید کا یہ کام بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا۔ ان دو کتابوں کی ہمارے ملک میں تو کچھ قدر نہ ہوئی اور قدر ہوئی تو یورپ میں۔ بعد کے زمانے میں "تاریخ فیروز شاہی" اور "تزک جہانگیری" کی ترتیب و تدوین کی۔

اب وہ وقت آیا جب کہ سرسید کے اصلی جوہر کھلے۔ غدر کا زمانہ مسلمانوں کے لیے قیامت کا زمانہ تھا۔ یوں تو مسلمانوں کا انحطاط اور زوال بہت پہلے شروع ہو گیا تھا مگر اس کا احساس عام طور پر نہیں ہوا تھا۔ جب ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے کے بعد جو غدر کے نام سے مشہور ہے، حکومت میں انقلاب پیدا ہوا تو مسلمان ہی سب سے زیادہ کچلے گئے۔ انگریز ان کو اس شورش کا بانی، اپنا دشمن اور حکومت کا غدار سمجھتا تھا اور ان کو مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کا قصور یہ تھا کہ انگریز نے حکومت ان سے لی تھی۔ اب وہ فاتح تھا اور یہ مفتوح۔ مفتوح ہندو بھی تھے مگر وہ ان کو اپنا مخالف نہیں بلکہ دوست سمجھتا تھا۔ ادھر ہندو جو مسلمانوں کا مفتوح رہ چکا تھا خوش تھا کہ اسے مسلمان سے بدلہ لینے کا اب موقع ملا ہے۔ مسلمانوں کی حالت بڑی نازک اور قابل رحم تھی۔ وہ چکی کے دو پاٹوں میں پسے اور دبے جا رہے تھے۔ اس سے دل بجھ گئے تھے، مایوسی اور افسردگی کا عالم تھا۔ دو بڑی قوتوں کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی اور وہ سمجھ چکے تھے کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ سید احمد خاں نے خود بھی ۱۸۵۷ء کے طوفان میں بہت تھپکیڑ اٹھائی تھی اور اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور ذلت کے ایسے دردناک منظر دیکھے تھے جو بھلائے نہیں بھولتے تھے۔ اس وقت مسلمانوں پر مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ان پر خود بھی کچھ دن مایوسی کا عالم رہا اور اس درد سے بے تاب رہے۔ یہاں ہم ان کی ایک تحریر پیش کرتے ہیں۔ جس کے ایک ایک لفظ سے ان کا درد دل اور قوم کی سوگواری ٹپک رہی ہے:

"بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سادات کے ایک
نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ ملکیت کا تھا، مجھ

Marfat.com

کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے
دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق کوئی دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر
تو یہ بربادی ہو اور میں جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں نے اس
کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا
نہیں ہے اور در حقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت
ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی اور
جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ چند روز
اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے
بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مراد آباد آیا
جو ایک بڑا غم کدہ ہمارے قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا تو
اس غم کو اور ترقی ہو گئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت
نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت
میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں، اس
کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کو
دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے، میں نے ارادۂ
ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا"۔

غدر کے زمانے میں سرسید بجنور میں تھے اور اس ضلع کا تمام نظم و نسق ان کے ہاتھ میں تھا۔ اگرچہ وہاں کے ہندو مسلمانوں نے اپنی خانہ جنگیوں سے طوفان مچا رکھا تھا اور خود سرسید کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ مگر غدر کے بعد محض سرسید کی بدولت یہ ضلع تمام سزاؤں اور آفتوں سے محفوظ رہا۔

۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے صدر الصدوری کے عہدے پر ترقی پا کر مراد آباد آ گئے۔

باغیوں کی تحقیقات کے لیے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اس میں صرف یہی ایک ہندوستانی ممبر تھے۔ انھوں نے معصوم اور بے خطا لوگوں کی بڑی دلیری سے حمایت کی اور بیسیوں کو پھانسی سے بچا لیا اور مراد آباد ہی میں انھوں نے وہ عظیم الشان خدمات انجام دیں جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ یعنی اپنی کتاب

Marfat.com

"اسباب بغاوت ہند" لکھی۔ ایک ایسے نازک زمانے میں جب کہ آزادی کے نام پر زبان کٹتی ہو، حاکم کی زبان ہی قانون ہو، مارشل لا کا دور دورہ ہو، مسلمان ہونا بذات خود ایک جرم ہو، "اسباب بغاوت" جیسی کتاب میں نہایت آزادی اور بے باکی سے ان الزامات کو بیان کیا ہے جو اس بارے میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے اور اہل ہند اور خاص کر مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے۔ اس پر انگریز بہت برہم ہوئے اور انھیں باغی اور قابل دار سمجھا گیا۔

۱۸۶۰ء میں بہت سخت قحط پڑا۔ سرسید نے مراد آباد میں ایسا اچھا انتظام کیا کہ حکومت اور رعایا نے ان کی بے حد تعریف کی۔ مراد آباد ہی میں سرسید نے ضیا برنی کی مشہور اور مستند تاریخ "تاریخ فیروز شاہی" کی ترتیب اور تدوین کی اور اسے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے طبع کیا اور یہیں انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا۔

۱۸۶۲ء میں سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور ہو گئی۔ یہاں انھوں نے ایک نہایت قابل قدر کام کیا۔ یعنی سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی جائیں۔ اس سوسائٹی نے متعدد کتابیں شائع کیں۔ غازی پور میں انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا جو اب تک جاری ہے اور اس میں ہائی اسکول تک پڑھائی ہوتی ہے۔

۱۸۶۴ء میں غازی پور سے تبدیل ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ سائنٹفک سوسائٹی بھی یہیں منتقل ہو گئی اور اس کے کام کو فروغ ہوا۔ اس میں سیاسی، اخلاقی، علمی معاشرتی اور ہر قسم کے مضامین چھپتے تھے۔ اس اخبار نے اردو صحافت پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ رواداری اور تنقید میں متانت اور سنجیدگی اس کا خاص وصف تھا۔

۱۸۶۷ء میں سرسید نے ایک عرض داشت دوبارہ قیام ورنی کلر یونی ورسٹی گورنر جنرل بااجلاس کونسل کی خدمت میں بھیجی۔ یہ بڑی اہم، دور رس اصلاحی بلکہ انقلابی تحریک تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک یونی ورسٹی قائم کی جائے۔ جس میں وہ تمام علوم و فنون جو کلکتہ یونی ورسٹی میں سیکھے جاتے ہیں اس درس گاہ میں دیسی زبان کے ذریعے پڑھائے جائیں اور ویسے ہی امتحان ہوں جیسے کلکتہ یونی ورسٹی میں ہوتے ہیں۔ اس عرض داشت میں انھوں نے انگریزی جیسی غیر اور اجنبی زبان کے ذریعے تعلیم دینے سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو صراحت سے بیان کیا ہے، لیکن

Marfat.com

حکومت نے اس کی ہمت افزائی نہ کی اور یہ تحریک آگے نہ چل سکی "ورنی کلر" سے مراد اردو زبان تھی۔

مسلمانوں کی تباہی اور بربادی اور ابتری کو دیکھنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ان کے سامنے یہ تھا کہ قوم کو اس ورطۂ مذلت سے کیوں کر نکالا جائے۔ بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کا علاج صرف تعلیم یعنی جدید مغربی تعلیم ہے ہماری ساری مصیبت پسماندگی اور محرومی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ جہالت تمام عیوب اور برائیوں کی جڑ ہے۔ اس لیے انھوں نے انگلستان کا سفر ضروری خیال کیا تاکہ بذات خود اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل کریں۔ غرض اپنا کتب خانہ بیچا اور گھر اور کوٹھی کو رہن کیا اور یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے ولایت روانہ ہوگئے۔

انگلستان میں ایک سال سے زیادہ رہے اور اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس آئے۔ وہیں انھوں نے اپنے منصوبے کا خاکہ تیار کرلیا تھا۔ وہ ہندوستان کے نظام تعلیم سے مطمئن نہ تھے اور اسے خصوصاً مسلمانوں کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم کے خلاف انھوں نے انگریزی میں ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اسی بنا پر ان کا اصل منشا مسلم یونی ورسٹی قائم کرنا تھا۔ ہندوستان پہنچ کر انھوں نے دو اہم کام شروع کیے۔

اوّل مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح اور ان کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس رسالے میں سرسید نے مذہب، اخلاق، معاشرت وغیرہ پر ایسے مضامین لکھے جن سے لوگوں میں ہل چل پیدا ہوگئی۔ توہمات اور تعصبات پر کاری ضرب لگی اور ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا کہ اس پر تنقیدی نظر نہ ڈالی ہو اور بڑی اخلاقی جرأت، دلیری اور بے باکی سے وہ بات کہہ دی اور لکھ دی جسے وہ سچ سمجھتے تھے۔ اس پرچے میں مجوزہ مدرسۃ العلوم کی تجویزوں اور کارروائیوں کی روداد چھپتی تھی۔ مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو بے حد نفرت تھی اس تعصب کو توڑنا آسان کام نہ تھا۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ اس میں عالم اور عامی دونوں متفق تھے۔ جب سرسید نے ان خیالات کا اظہار کیا اور مغربی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان برپا ہوگیا اور انھیں کافر، ملحد، لامذہب، دجال، کرسٹان کے خطاب، عطا ہوئے اور کفر کے فتوے لکھے گئے۔ لیکن انھوں نے اس مخالفت کی مطلق پروا نہ کی اور

Marfat.com

بڑے استقلال سے اپنا کام جاری رکھا، مدرستہ العلوم مسلمانان (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کا افتتاح ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو عمل میں آیا اور لارڈ لٹن وائسرائے نے دلی کے دربار قیصری کے بعد علی گڑھ آکر ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کا بنیادی پتھر رکھا۔

سرسید کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ یہ تعلیم گاہ ہی نہیں تھا، تربیت گاہ بھی تھا اور کتابی اور علمی درس کے ساتھ انسان گری اور سیرت کا بھی سبق دیتا تھا۔ اس نے نہ صرف مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کیا اور دور دور سے طالب علم آکر شریک ہوئے بلکہ یہ روشن خیالی اور قومیت کا سرچشمہ اور مسلمانوں کی علمی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی غرض ہر قسم کی تحریک کا مرکز بن گیا اور اس کی بدولت مسلمانوں کا وقار بڑھ گیا۔ اس کالج کے طالب علموں نے مختلف حیثیتوں سے بڑا نام پایا اور اچھے کام کیے۔ آج یہی کالج ترقی کرتے کرتے مسلم یونی ورسٹی ہو گیا ہے۔

ان کا دوسرا بڑا کام "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" ہے جو اب "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ کانفرنس ۱۸۸۶ء میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا شوق پیدا کیا جائے۔ اس کے اجلاس ملک کے مختلف مقامات میں ہوتے تھے اور دور دراز مقامات سے لوگ اس میں شریک ہوتے تھے اور ترقی تعلیم کے متعلق تجویزیں پیش ہوتیں اور ان پر بحث ہوتی تھی۔ تعلیمی اور علمی موضوعات پر لکچر دیے جاتے تھے۔

من جملہ بے شمار احسانات کے جو سید احمد خاں کے ہماری قوم پر ہیں ان کا بہت بڑا احسان اردو زبان پر ہے۔ انھوں نے زبان کو پستی سے نکالا۔ انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی۔ سنجیدہ مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جدید علوم وفنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے، اخبار سائنٹفک سوسائٹی (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) جاری کرکے اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا۔ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ ٹائپ کو رواج دیا۔ یہ اردو زبان کے فروغ کا زمانہ تھا اور اردو ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا۔

سرسید نے اردو زبان کی ہمیشہ حمایت کی اور جب کبھی اس پر آنچ آئی تو وہ سینہ سپر ہو گئے۔ ۱۸۶۷ء کا واقعہ ہے کہ ہندوؤں نے تمام سرکاری دفتروں اور

Marfat.com

عدالتوں سے اردو کو خارج کرنے اور اس کے بجائے ہندی بھاشا رائج کرنے کی کوشش کی۔ اور اس منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے سبھائیں بنائیں اور سرکار میں محضر بھیجے۔ سرسید کو اس سے بہت رنج اور صدمہ ہوا اور انھوں نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔ سرسید اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ:

"تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹادیا جائے۔ اس وقت سے مجھ کو یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے۔ میں نہایت دوستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو اور مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی"۔

اس وقت سے محض اردو کی مخالفت کی وجہ سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہو گئیں اور دو قومی نظریے کی بنیاد پڑی اور یہی دو قومی نظریہ پاکستان کی بنا کا باعث ہوا۔

سرسید اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گئے ہیں جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اس برعظیم کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم و فضل، پاک نفس بزرگ اور مصلح گزرے ہیں۔ ان کا دائرہ عمل محدود تھا، لیکن سرسید کا میدان عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ ایسا جامع صفات اور جامع حیثیات بے لوث و بے نفس، پُرعزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت اور ہمہ تن ایثار مصلح ہمیں نہ اس سے پہلے نصیب ہوا نہ اس کے بعد۔ اس نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں ایک نئی روح پھونکی اور ایسا جذبۂ قومی پیدا کیا جو اب تک کام کررہا ہے۔ حق یہ ہے کہ قومیت کا خیال بھی اس کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر اس کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا

Marfat.com

جائے تو معلوم ہوگا کہ قصر پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیر مرد نے رکھی۔ اس کا دل قوم کی دردمندی سے لبریز تھا۔ عمر بھر اسی دھن میں لگا رہا اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے ۱۸۹۸ء میں اس دنیا سے چل بسا۔

# سرسید بحیثیت مفکرِ اعظم

ایسے جلیل القدر مفکر جنھوں نے اپنی قوت فکر و عمل سے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، قوموں کی قسمتیں بدل دیں اور ان کو پستی و درماندگی کی دلدل سے نکال کر صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی، صدیوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ سرسید احمد خاں کا شمار ایسی ہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے۔

ابتدا میں اس زمانے کے رواج کے مطابق عربی فارسی کی متداول کتابیں پڑھیں۔ لیکن یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ لڑکپن میں انھوں نے اپنے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کی تربیت سے فیض حاصل کیا۔ خواجہ فرید بڑے مدبر، اور صاحب علم و فضل تھے۔ خصوصاً فنون ریاضیات میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ ان کے فرزند یعنی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین ریاضی میں اپنے باپ کے شاگرد تھے اور ان کی ریاضی دانی کی بڑی شہرت تھی۔ سرسید نے ریاضی میں حساب، تحریر اقلیدس، ہئیت اور آلات رصد وغیرہ، اعمال اصطلاحات کی تعلیم اپنے ماموں ہی سے حاصل کی۔ نیز اپنے نانا کے بعض مقالات ریاضی کا ترجمہ اردو میں کیا۔ ریاضی میں غور و فکر لازم ہے۔ جذبات کا اس میں دخل نہیں اس کے تمام مسائل اور نتائج عقلیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ریاضی ذہن، قوا میں روشنی اور براقی پیدا کرتی اور نہایت دشوار اور صبر آزما ذہنی مسائل تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون نے اپنی اکیڈمی کے دروازے پر لکھ رکھا تھا کہ "جو شخص ریاضی نہیں جانتا وہ اس کے اندر قدم نہ رکھے"۔

اس کے کچھ عرصے بعد جب ان کی عمر انتیس تیس برس کی تھی "آثار الصنادید" کی ترتیب کا کام شروع کیا۔ یہ دشوار کام انھوں نے بڑی محنت اور تحقیق سے انجام دیا

Marfat.com

اس میں جسمانی اور دماغی دونوں قسم کی محنت صرف کرنی پڑی۔ اس کی قدر یورپ میں ہوئی۔ مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا اور ایشیاٹک سوسائٹی آف برٹین اینڈ آئرلینڈ نے ان کو اپنی سوسائٹی کا آنریری ممبر نامزد کیا۔ ان کا دوسرا ابتدائی علمی کارنامہ "آئین اکبری" کی تصحیح و ترتیب ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی بے نظیر کتاب ہے جو اکبر کے عہد کی ہر قسم کی معلومات کا بے بہا خزانہ ہے۔ اس کی زبان اور طرز بیان بھی نرالا ہے۔ اس میں مختلف انواع اقسام کے معلومات جن کا امور سلطنت اور حیات انسانی سے کچھ بھی تعلق ہے ایسے جمع کر دیے ہیں کہ ان کا صحیح طور پر سمجھنا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کی ترتیب و تصحیح میں انھوں نے تحقیق و تلاش کی پوری داد دی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ متعدد نسخے جمع کر کے تصحیح کی ہو بلکہ جو غلطیاں فاضل مصنف سے ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کی۔ کئی سو سکوں کی تصویریں درج کیں اور ہر آئین میں موقع موقع سے بے شمار تصویریں بنوا کر داخل کیں۔ کچھ عرصے بعد مشہور اور مستند "تاریخ فیروز شاہی" کی تصحیح و ترتیب کی جسے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کیا۔ حیرت ہے کہ ایسے زمانے میں اور ایسی صحبتوں میں جب کہ ہمارے ادب کا رنگ کچھ اور ہی تھا انھیں اس قسم کی تحقیقات کا خیال کیسے پیدا ہوا۔ تاریخ کے مطالعے سے بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ معاملات جانچنے اور سوچنے کا شعور آتا ہے اور دنیا کا نشیب و فراز اور انسانی فطرت سے آگاہی ہوتی ہے۔ ریاضی اور تاریخ کے مطالعے نے ان کی دماغی تربیت کا سامان مہیا کیا جسے سرسید کے کارناموں کی بنیاد سمجھنا چاہیے جو ان سے ظہور میں آئے۔

لیکن جس واقعے نے ان کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کیا وہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تھا۔ اس المناک سانحے کو جس نے ملک کے تمام نظم و نسق اور معاشرے کی چولیں ڈھیلی کر دی تھیں نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ ایسی کھکھیڑیں اٹھائیں جو ناقابل برداشت تھیں۔ دوسرے ہی سال انھوں نے "اسباب بغاوت ہند" کا مشہور رسالہ لکھا۔ یہ سراسر اُن کے مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ کسی نے اس نہج سے اس معاملے پر غور نہیں کیا تھا جیسا سرسید نے۔ انھوں نے صاف صاف بلا رو رعایت نہایت جرأت و آزادی سے اسباب بغاوت سے بحث کی۔ مسلمانوں کو جو انگریزوں کی نظروں میں بغاوت کے سب سے بڑے مجرم تھے اس الزام سے بری کرنے کی کوشش

Marfat.com

کی۔ اور اس کا باعث گورنمنٹ کی غلطیوں اور خامیوں کو قرار دیا۔ ایسے نازک وقت میں جب کہ غدر کا گھاؤ تازہ تھا اور انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے غیض و غضب کی آگ بھڑک رہی تھی، جب کہ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکم کی زبان ہی قانون تھی۔ خصوصاً جب کہ بقول مولانا حالی "مسلمان ہونا ہی ایک بڑا سخت جرم سمجھا جاتا تھا" ایسی کتاب لکھنا جان سے کھیلنے کے مساوی تھا۔ اگرچہ انگریز اور اعلیٰ حکام بہت برہم ہوئے لیکن آخر کار سچ کی جیت ہوئی اور ہندوستان کی سیاست اور حکومت پر اس کا اثر ہوا۔

اس کے بعد ایک اور بڑا کام کیا۔ انگریزوں کے دلوں میں عام طور پر مسلمانوں کی طرف سے بغاوت وعداوت کے خیالات جمع ہوئے تھے۔ سرسید نے مختلف طریقوں سے ان خیالات کے محو کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سب سے زیادہ زہریلی تھی جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان قوم انگریزی حکومت سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے۔ سرسید نے پرزور دلائل اور قوی شہادتوں سے اس کتاب کی غلطیوں اور بہتانوں کا پردہ چاک کر دیا۔ انگلستان میں اس پر بہت اچھے اور تعریفی ریویو شائع ہوئے۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ مسلمانوں کے حق میں قیامت کے ہنگامے سے کم نہ تھا۔ انگریز مسلمانوں کو اس شورش کا بانی، اپنی حکومت کا غدار اور باغی سمجھتا تھا اور ان کے مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ دوسری طرف برادران وطن کو قدرت کی طرف سے انتقام کا موقع مل گیا۔ ان دو عیار اور قوا قوموں کا مقابلہ مسلمانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ بے یارومددگار تھے۔ ان پر مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ خود سرسید احمد خاں مسلمانوں کی حالت سے اس قدر مایوس ہو گئے تھے کہ ترک وطن کر کے کسی دوسرے اسلامی ملک میں بس جانے کی ٹھان لی تھی۔ لیکن ان کے ضمیر نے ملامت کی کہ قوم کو جلتی آگ میں چھوڑ کر گوشۂ عافیت میں جا بیٹھنا انتہائی بزدلی اور خلاف انسانیت ہے۔ وہ ملک و قوم کی خدمت اور اصلاح پر کمر بستہ ہو گئے۔

ملازمت کے سلسلے میں جہاں جہاں رہے وہاں مدرسے اور تعلیمی کمیٹیاں قائم کیں۔ اس زمانے (۱۸۵۷ء) میں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں قائم کی جس کے ذریعے انگریزی سے علمی و تاریخی کتابوں کے ترجمے کر کے ملک میں علم کی

Marfat.com

روشنی پھیلانا مقصود تھا۔ اس سوسائٹی کی جانب سے مشہور اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" شائع کیا جس کا لوگوں کے خیالات نیز اردو صحافت پر بڑا اچھا اثر ہوا۔ سید احمد خاں پہلے شخص تھے جنھوں نے ۱۸۶۷ء میں ورنی کلر (یعنی اردو) یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز گورنمنٹ میں پیش کی۔ لیکن گورنمنٹ نے بعض وجوہ سے اس میں مدد دینے سے انکار کردیا۔

یوں تو قومی بھلائی کی مختلف تدبیروں میں سرگرم رہے لیکن اب انھوں نے اصل مسئلے پر غور کرنا شروع کیا جس کے پیچھے ان کی باقی ساری زندگی صرف ہو گئی وہ یہ کہ مسلمانوں کی پسماندگی اور پستی کے اصل اسباب کیا ہیں، شب و روز کے کامل غور و فکر کے بعد ارشمیدس کی طرح یک بارگی چلا اٹھے "یوریکا یوریکا" پالیا پالیا۔ یعنی مسلمان زمانے کے تقاضے کو نہیں سمجھتے اور جدید حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ ان تمام خامیوں اور محرومیوں کا علاج تعلیم ہے اور تعلیم بھی جدید تعلیم۔ اس کے لیے انگلستان کا قیام اور وہاں کے نظام تعلیم پر غور کرنا ضروری تھا۔ حسن اتفاق سے اس کی بھی صورت نکل آئی۔ انگلستان میں تقریباً ڈیڑھ سال رہ کر انھوں نے دو بڑے اہم کام کیے۔ ایک تو وہاں کے تعلیم و تربیت کا بغور مطالعہ کیا۔ دوسرے سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھا جس میں اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔ ہندوستان میں اس کے جواب کے لیے کافی سامان نہ ہونے کی وجہ سے انگلستان سے پھر کر "خطبات احمدیہ" جیسی بے مثل محققانہ کتاب تصنیف کی۔ یہ تصنیف سرسید کی تحقیق اور تعمق نظر کی یادگار ہے اور اس قابل ہے کہ ہماری درس گاہوں اور یونی ورسٹی کے نصاب تعلیم میں اسے داخل کیا جائے۔

انگلستان سے آکر سرسید نے دو عظیم الشان کام کیے جو ان کے کارناموں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک "تہذیب الاخلاق" کا اجرا جس کا مقصد نہ صرف معاشرت، تہذیب، اخلاق اور مذہبی خیالات کی اصلاح تھا بلکہ اس نے اردو ادب اور انشا پردازی میں انقلاب پیدا کردیا۔ دوسرا مدرسۃ العلوم مسلمانانِ یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام جو اپنی نوعیت کا واحد کالج تھا۔ جو اقامتی اصول پر قائم کیا گیا تھا۔ اس کالج نے قوم میں نئی روشنی اور نئی بیداری پھیلادی۔ نوجوانوں کی ذہنیت کو بدل دیا۔ جس سے قوم کے پنپنے کی امیدیں بڑھ گئیں رفتہ رفتہ یہ کالج مسلمانوں کی روشن خیالی، تعلیم و تہذیب،

Marfat.com

سیاست اور علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ کالج کے حیس و برکات کے نشان بر عظیم پاک و بھارت میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ کالج کے قیام کے بعد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس نے تعلیم کا چرچا ملک بھر میں پھیلا دیا۔ سید صاحب دارالعلوم یعنی یونی ورسٹی بنانا چاہتے تھے۔ حکومت نے ہمت افزائی نہ کی۔ لیکن ان کی زندگی کے بعد ان کی آرزو پوری ہوئی اور کالج یونی ورسٹی بن گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سائنس کا ریلا بڑھتا چلا آرہا تھا اور اس نے مذہبی عقائد متزلزل کر دیے تھے۔ سرسید یہ سب کچھ دیکھ چکے تھے۔ مغربی تعلیم کو رائج کر کے اس خطرے سے دوچار ہونا لازم تھا۔ لہذا اس سیلاب کی روک تھام کے لیے انھیں مذہب کے قلمرو میں دخل دینا پڑا۔ نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ تفسیر قرآن اور بے شمار مضامین لکھ کر یہ ثابت کیا کہ جدید فلسفہ اور سائنس سے اسلام کی حقانیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کا قلع قمع کیا اور سنت اجتہاد کو از سر نو زندہ کیا۔

مزید تعلیم کے اجرا اور مذہبی امور میں دخل دینے سے سرسید کے خلاف مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا اور کافر، ملحد، لامذہب و دجال، کرسٹان کے خطاب عطا ہوئے۔ لیکن وہ بڑے استقلال اور جرأت سے اپنے اصول پر قائم رہے۔ آخر زمانے نے ان کے حق میں فیصلہ کیا۔

سیاست میں سرسید کو مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس کے ماحول و خیالات سے بچانے کے لیے دخل دینا پڑا۔ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی تقریروں اور مضامین میں اس امر کا اظہار کیا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ براعظم ہے جس میں مختلف الجنس اقوام آباد ہیں۔ سب سے پہلے سید نے مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا اور لفظ "قوم" کو "نیشن" کا ہم معنی بنا دیا۔

یوں تو سید کے احسانات گوناگوں ہیں۔ لیکن ان کا ایک بڑا احسان اردو زبان پر ہے۔ زبان کو پستی سے نکالا انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی اور سنجیدہ علمی مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا اور اردو زبان کی حمایت میں آخر دم تک لڑتے رہے۔ وہ شخص جو ایک مدت تک ہندو مسلم اتحاد کے لیے جان لڑاتا رہا، آخر اردو کی پیہم مخالفت دیکھ کر اسے اس سے ہاتھ اٹھانا پڑا اور ساری ہمت مسلمانوں کی اصلاح پر صرف کر دی۔

سید نے (خدا کی اس پر رحمتیں ہوں) ہماری زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کی۔

Marfat.com

تعلیم، معاشرت، مذہب، سیاست، زبان اور ادب سب پر اس کا احسان ہے۔ وہ جیسا مفکر عظیم تھا ویسا ہی میدان عمل میں مجاہد بھی تھا۔ ایسا جامع صفات بے لوث و بے نفس، پر عزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت اور ہمہ تن ایثار مصلح ہمیں اس سے پہلے نصیب ہوا اور نہ اس کے بعد۔

اس وقت پاکستان کو ایک ایسے ہی بڑے مفکر اور با عمل ہستی کی ضرورت ہے۔

Marfat.com

# ضمیمہ

## شہاب قدوائی

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت جو دہلی سے راس کماری اور کشمیر سے افغانستان تک دکھائی دیتی تھی وہ اتنی مضبوط ثابت نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب کے بعد اس کے جانشینوں میں کوئی بھی اس قابل نہ تھا جو اتنی بڑی حکومت اور سلطنت کو یکجا اور متحد رکھ سکتا۔ رفتہ رفتہ حکومت، سلطنت، اقتدار اور جانشینی کے لیے کشت و خون، سازشوں اور مخالفتوں کا وہ لامتناہی سلسلہ چلا جس کا اختتام آخری مغلیہ تاجدار کی بغاوت کے جرم میں ہونے والی گرفتاری، جلاوطنی اور مغل سلطنت کے خاتمے پر ہوا۔ یوں تو تجارت کے لیے انگریزوں کی آمد کا سلسلہ اٹھارویں صدی میں کسی نہ کسی طرح شروع ہوچکا تھا اور جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور ٹیپو سلطان کی شہادت (۱۷۹۹ء) کے بعد انگریزی فوج (۱۸۰۳ء) میں دہلی میں داخل ہو کر اقتدار کی ساجھے دار بن چکی تھی مگر قلعۂ معلیٰ کی ساکھ کسی حد تک برقرار تھی۔ جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی کے بعد وہ رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو گئی اور مغلیہ سلطنت اور مغلیہ خاندان کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کا شیرازہ کچھ اس طرح بکھرا جو اب تک یکجا و متحد نہ ہوسکا۔ جنگ آزادی کی اس ناکامی میں جہاں سازشوں اور آپسی نفرتوں کا دخل رہا ہے وہاں کئی سو سالہ مسلم حکومت، کے زیر نگیں رہنے والے ہندوؤں کو انتقام کا ایک موقع بھی مل گیا جس کا انھوں نے بھرپور ڈھنگ سے فائدہ اٹھایا، گو کہ مسلم حکمرانوں اور جاگیرداروں کے ایک بڑے طبقہ نے بھی اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے جنگ آزادی کو کچلنے کی سازش میں ممکنہ حد تک حصہ لیا۔

سرسید کے پیش نظر یہ سارے حقائق تھے۔ جنگ آزادی کی ناکامی سے وہ بڑے

Marfat.com

دلبرداشتہ اور مایوس تھے۔ مگر کچھ عرصے کے بعد مایوسی کا یہ عارضی دور ختم ہو گیا اور انھوں نے بغاوت اور اس کی ناکامی پر از سرِ نو نئے عزم سے غور و فکر شروع کی۔ ان کی یہ کوشش "اسبابِ بغاوت ہند" کی صورت میں منظر پر آئی جس نے انگریزی حکومت اور انگریز حکام کو مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویہ پر غور کے لیے مجبور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے سلسلے میں انگریز حکام کے بھی برتاو میں کچھ تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انگریزوں کے ساتھ بالواسطہ ٹکراؤ پر مبنی رویہ کے بجائے ایک مفاہمت اور صلح جوئی پر مبنی پالیسی کو آگے بڑھانے پر غور کیا کیونکہ ان کے حساب سے مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے ظلم اور زیادتی کو ختم کرنے کا یہی ایک راستہ تھا۔ اس کے لیے اُنھوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کرنے کے لیے برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کی تشکیل کی جو ایک مفید قدم ثابت ہوا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے "سائنٹفک سوسائٹی" بھی قائم کی، جس کا خاص مقصد مسلمانوں میں سائنس اور مغربی علوم کی روشنی کو پھیلانا تھا۔ کیونکہ اس تغیر پذیر معاشرت میں مغربی علوم اور سائنس کی نئی ایجادات کو جانے اور سمجھے بغیر زندگی کی دوڑ میں کامیابی کی اُمید کم کم ہی تھی، مغربی علوم و فنون سے مسلمانوں کو روشناس کرانے کے لیے ہی ۱۸۶۶ء میں سر سید احمد خاں نے "علی گڑھ گزٹ" کا اجرا کیا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک سے متعلق ولیم میور کی دل آزار کتاب "Life of Mohammed" شائع ہوئی جس نے مسلمانوں میں غم و غصہ کے ساتھ اشتعال پیدا کر دیا۔ اس قابلِ اعتراض کتاب کی اشاعت سے سر سید کو بھی بڑا رنج پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کا بھرپور جواب دینے کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں میں پھیلے اشتعال کو کم کیا جائے اور انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں اور اسلام کے سلسلے میں موجود بدگمانیوں کو دور کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا جب خاطر خواہ مواد یہاں دستیاب نہ ہوسکا تو انھوں نے اس کے لیے لندن کا سفر کیا۔ لندن کے دوران قیام ہی کیمبرج کے طرزِ تعلیم پر ایک دارالعلوم کے قیام کے بارے میں اُنھوں نے غور شروع کیا، جو بعد میں علی گڑھ یونی ورسٹی کی شکل میں عمل میں آیا۔ سر سید کے سفرِ لندن کا خصوصی کارنامہ "خطبات احمدیہ" ہے جس کے تحت اُنھوں نے ولیم میور کی کتاب کے ذریعہ پھیلائی جانے والی گمراہیوں کا مدلل جواب دیا ہے۔

سر سید نے انگلستان کی طرزِ معاشرت پر اخبارات اور رسائل کے پڑنے والے اثرات کا بخوبی جائزہ لیا۔ اُنھوں نے واپس ہندوستان آکر رسالہ "تہذیب الاخلاق" نکالا۔ جس کے گہرے نقوش ہندوستانی سماج اور معاشرت پر پڑے۔ علی گڑھ تحریک نے اردو زبان و ادب

کو بھی نمایاں طور پر متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کو وسعت ملی اور اس کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ یہی نہیں زبان کے ساتھ ساتھ ادب کی مختلف اصناف میں تبدیلی اور تغیر آیا۔ نئے اسالیب اور موضوعات کو ادب میں جگہ ملی جس سے ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا اور وہ ترقی کی نئی راہوں پر گامزن نظر آیا۔

سرسید نے کافی عرصہ تک ہندوستان کے لوگوں یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی ترقی اور بھلائی کے لیے کام کیا لیکن جب ہندوؤں نے اردو، ہندی کا تنازع کھڑا کر کے ذریعہ تعلیم کو اردو کے بجائے ہندی میں کیے جانے کی تحریک شروع کی تو سرسید جیسے وطن دوست شخص نے بھی یہ کہہ کر کہ افسوس اس ملک میں اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں رہا۔ دو قومی نظریے کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ سرسید نے جس دو قومی نظریہ کی نشاندہی کی تھی وہی بعد میں نواب وقار الملک کے ذریعہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کی بنیاد بنا اور نواب وقار الملک اس مسلم لیگ کے سیکریٹری مقرر ہوئے جس نے آگے چل کر قرارداد پاکستان کے ذریعہ "پاکستان" کے نام سے ایک علاحدہ ملک کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ کی بنیاد پر ہی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کے ساتھ ساتھ ایک علاحدہ وطن پاکستان وجود میں آیا۔

## سرسید احمد خاں کی زندگی کے اہم واقعات اور کارنامے

**دہلی میں نانا دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین کے یہاں ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔**

۱۔ آگرہ کے کمشنر دفتر میں بطور نائب منشی ۱۸۳۹ء میں تقرر۔

۲۔ "جام جم" کے نام سے فارسی میں پہلی تاریخی کتاب مئی ۱۸۴۵ء میں شائع ہوئی، جس میں امیر تیمور سے لے کر دہلی کے آخری تاجدار، بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کے مختصر حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

۳۔ منصفی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۲۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو مین پوری میں بطور منصف تقرر۔

۴۔ ۱۸۴۲ء میں بطور منصف فتح پور سیکری تبادلہ۔

۵۔ والدہ کی تنہائی کے پیش نظر ۱۸۴۶ء میں دہلی تبادلہ کرالیا۔

۶۔ "آثار الصنادید" کے نام سے دہلی کی عمارتوں کے بارے میں کتاب کی پہلی اشاعت ۱۸۴۷ء بشمول تقریظ غالب۔

۷۔ "آثار الصنادید" کا نظر ثانی کیا ہوا اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۸۵۴ء۔

۸۔ بجنور میں ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو بطور صدر امین تقرر۔

۹۔ "آئینِ اکبری" کی تصحیح، مشکل مقامات کی وضاحتوں، فارسی، عربی، سنسکرت اور ترکی

اصطلاحات کی تشریح کے علاوہ بڑی تعداد میں تصاویر کو شامل کر کے اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۸۵۶ء میں شائع ہوا۔

۱۰۔ سر سید احمد خاں کی والدہ عزیز النساء بیگم کا ۱۹ نومبر ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں انتقال۔

۱۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں مراد آباد کے صدر الصدور کی حیثیت سے تقرر۔

۱۲۔ "اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت اپریل ۱۸۵۹ء۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی "انڈین نیشنل کانگریس" کے بانی مسٹر اے۔ او۔ ہیوم کے ذہن میں کانگریس کے قیام کا خیال پیدا ہوا۔

۱۳۔ "آثار الصنادید" کے فرانسیسی ترجمہ کی اشاعت ۱۸۶۱ء۔

۱۴۔ ۱۸۶۱ء میں سر سید کی اہلیہ پارسا بیگم کا انتقال۔

۱۵۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سیکریٹری کی درخواست پر انھوں نے ۱۸۶۲ء میں تاریخ فیروز شاہی کی تدوین و تصحیح کی اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا۔

۱۶۔ ۱۸۶۲ء میں مراد آباد سے غازی پور تبادلہ۔

۱۷۔ کلکتہ کا پہلا سفر ۱۶ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو کیا جہاں دورانِ قیام اُنھوں نے کلکتہ لٹریری سوسائٹی کے تحت مذاکرۂ علمیہ میں تقریر کی۔ سر سید احمد خاں نے کلکتہ کے سفر کے دوران جن جن شہروں میں قیام کیا وہاں سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی ترویج اور ترقی کے لیے لوگوں کو اُس کے مقاصد سے آگاہ کیا۔

۱۸۔ توزک جہانگیری کی تصحیح اور اشاعت ۱۸۶۳ء۔

۱۹۔ مغربی زبانوں میں موجود علوم و فنون کو ہندوستانی زبان میں ترجمہ کی غرض سے ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سائنٹفک سوسائٹی کے سر سید احمد خاں اور کرنل گراہم دونوں سیکریٹری مقرر ہوئے۔

۲۰۔ اپریل ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ تبادلہ۔

۲۱۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے ۴ جولائی ۱۸۶۴ء کو اعزازی رکن منتخب۔

۲۲۔ اس وقت صوبہ شمال مغرب کے لیفٹننٹ گورنر مسٹر ڈریمنڈ نے ۳۰ نومبر ۱۸۶۴ء کو سائنٹفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا۔

۲۳۔ سائنٹفک سوسائٹی کی عمارت کا افتتاح ۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو میرٹھ کے کمشنر مسٹر ولیمس کے ہاتھوں ہوا۔

۲۴۔ ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو اخبار سائنٹفک سوسائٹی کا اجرا۔ بعد میں یہی اخبار الیسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے مشہور ہوا اور ایک قومی اخبار بنا۔

Marfat.com

۲۵- برٹش انڈیا ایسوسی ایشن ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو قائم کی۔ جس کا مقصد تعلیمی اور دیگر انتظامی امور کے سلسلے میں عوامی نقطۂ نظر کو واضح کرنا تھا۔

۲۶- برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے سیکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے حکومت کو یکم اگست ۱۸۶۷ء کو ایک ورنیکلر یونی ورسٹی جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہو قائم کرنے کے سلسلے میں عرض داشت پیش کی۔

۲۷- اگست ۱۸۶۷ء میں علی گڑھ سے بنارس تبادلہ اور عدالت خفیفہ کے جج کے عہدہ پر ترقی ہوئی۔

۲۸- لندن میں سید محمود کی تعلیم کا انتظام کرنے، سر ولیم میور کی کتاب "حیات محمد ﷺ" کا جواب تحریر کرنے اور مغربی تعلیم سے براہ راست معلومات حاصل کرنے کی غرض سے اُنھوں نے یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے۔

۲۹- سر ولیم میور کی کتاب "حیات محمد ﷺ" کی تردید میں ان کے ۱۲ مقالات ۷۰-۱۸۶۹ء کے درمیان شائع ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے مقالات کا انگریزی ترجمہ کرایا۔ اس انگریزی کتاب کا اردو ایڈیشن مع جدید اضافوں کے "خطبات احمدیہ" کے عنوان سے تقریباً سترہ سال کے بعد ۱۸۸۷ء میں شائع ہوا۔

۳۰- لندن سے واپس آکر ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اُنھوں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔

۳۱- ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم (ایم۔ اے۔ او کالج) کا افتتاح۔

۳۲- سر سید احمد خان نے ۳۱ جولائی ۱۸۷۶ء کو ملازمت سے قبل از وقت سبکدوشی کے لیے درخواست دی۔ بعد از منظوری چار سو روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی۔

۳۳- گورنر جنرل آف انڈیا کی کونسل کے ممبر کی حیثیت سے ۱۸۷۹ء میں نامزدگی۔

۳۴- کالج کے لیے فنڈ جمع کرنے کے لیے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کا دورہ۔

۳۵- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ۱۸۸۶ء میں قیام۔

۳۶- سید محمود کی ۱۸۸۸ء میں شادی۔

۳۷- ایڈنبرا یونی ورسٹی سے ۱۸۸۹ء میں سر سید احمد خاں کی تعلیمی، تصنیفی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری کی تفویض۔

۳۸- سر سید کے بڑے بیٹے سید حامد کا جنوری ۱۸۹۴ء میں انتقال۔

۳۹- کالج کے ہیڈ کلرک شیام بہاری لعل ماتھر نے کالج فنڈ میں ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کا غبن کیا۔ سر سید احمد خاں کی صحت پر اس حادثہ کا بڑا برا اثر پڑا۔

۴۰- ہز ہائنس محمد شاہ آغا خاں سوم کو سپاس نامہ پیش کیا جس کے بعد آغا خاں کا اس ادارہ

Marfat.com

سے گہرا تعلق شروع ہوا۔ کالج کو یونی ورسٹی بنانے کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی آغاخاں اس کے صدر مقرر ہوئے۔

۴۱۔ مختصر علالت کے بعد سر سید ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کی شب کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

۴۲۔ ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو کرکٹ گراؤنڈ میں نمازِ جنازہ اور جامع مسجد علی گڑھ میں آخری آرام گاہ قائم ہوئی۔

نوٹ: اس ضمیمہ کی تالیف میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۱) حیات جاوید۔ مولانا الطاف حسین حالی
(۲) سر سید حالات و افکار۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق
(۳) سر سید اور ان کے نامور رفقا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ
(۴) تحقیقی ادب۔ ادریس جمال
(۵) نقوشِ ادب۔ فرزانہ سید
(۶) اردو ادب کی تحریکیں۔ ڈاکٹر انور سدید
(۷) Saiyid Ahmed Khan An Annotated Chronology by Public Relation Office Alighar Muslim University Alighar.

Marfat.com

مولوی عبدالحق کی ولادت ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء کو ہاپوڑ میں ہوئی۔
اُنھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے ۱۸۹۳ء اور
بی۔ اے الہ آباد یونی ورسٹی سے ۱۸۹۵ء میں پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں
مدرسہ آصفیہ حیدر آباد (دکن) میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ان کو ۱۹۱۲ء میں
انجمن ترقی اردو کا سیکریٹری بنایا گیا، وہ ۱۹۱۲ء ہی میں صوبہ اورنگ آباد کے
انسپکٹر آف اسکول مقرر ہوئے۔ دارالترجمہ حیدر آباد میں بطور ناظم ۱۹۱۷ء میں
تقرر ہوا۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں حیدر آباد (دکن) سے سہ ماہی تحقیقی مجلہ "اردو"
جاری کیا۔ ۱۹۲۴ء میں عثمانیہ کالج، اورنگ آباد کے پرنسپل مقرر ہوئے۔
جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے ۱۹۳۰ء میں بطور پروفیسر منسلک ہوئے۔
"انجمن ترقی اُردو کے ترجمان "ہماری زبان" کا ان کی ادارت میں یکم اپریل ۱۹۳۹ء
کو اجرا ہوا۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں سہ ماہی رسالے "معاشیات" کو جاری کیا۔
قیام پاکستان کے بعد وہ انجمن ترقی اُردو پاکستان کے ۱۹۴۸ء تا ۱۹۴۹ء
سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں کراچی سے پندرہ روزہ "قومی زبان" جاری
کیا۔ سہ ماہی تحقیقی مجلہ "اردو" کا ۱۹۴۹ء میں پاکستان سے اجرا ہوا۔ انھوں نے
۱۹۵۰ء سے (تاحیات) ۱۹۶۱ء تک انجمن ترقی اُردو پاکستان کے صدر کے طور
پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۹ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے
مولوی عبدالحق کو اردو لغت بورڈ (ترقی اردو بورڈ) کا اولین مدیر اعلیٰ نامزد کیا گیا۔
۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو بعداز مختصر علالت کراچی میں انتقال ہوا۔

Marfat.com